

A CRY IN THE NIGHT

A Novel by the Author of A STRANGER IS WATCHING

Mary Higgins Clark

Mary Higgins Clark کا پہلا ناول Where are the children تھا جسے آپ سسپنس میں "بچے کہاں ہیں" کے عنوان سے پڑھ چکے ہیں۔ دوسرا ناول A Stranger is watching تھا۔ یہ بھی سسپنس کے ذریعے آپ کے مطالعہ میں آچکا ہے۔

جاسوسی ڈائجسٹ کی کاپیاں پریس جانے ہی والی تھیں کہ اطلاع ملی موصوفہ کا نیا ناول Acry in the Night آگیا ہے۔ ایک سال قبل مصنفہ کے ایک انٹرویو کے ذریعہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ ان کا موجودہ ناول آنے والا ہے۔ میں اسی وقت سے اس ناول کا منتظر تھا۔ کوشش کی تھی کہ فوری طور پر یہ ناول امریکہ سے منگوایا جاسکے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ بہرحال ناول کے ہاتھ میں آتے ہی یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ ایسا کون شخص ہے جو نہ صرف یہ کہ اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کرسکے بلکہ وقت پر مکمل بھی کردے۔ بالآخر نظر احمد اقبال پر پڑی۔ مجھے خوشی ہے کہ موصوف نے نہ صرف یہ کہ ناول وقت پر مکمل کردیا بلکہ میرے اس خیال کو بھی باطل ثابت کردیا کہ شاید جلدی کی وجہ سے ناول میں خامیاں رہ جائیں۔ اتنے کم وقت میں ناول کو محدود صفحات میں مکمل کرنے کے ساتھ مشرقی ماحول میں ڈھالنا احمد اقبال ہی کا کام تھا جسے انہوں نے احسن طریقے سے پورا کیا ہے۔ اس کے تعارف میں اتنا کہنا کافی ہے کہ اسے امریکہ کی مقبول ترین مصنفہ نے لکھا ہے اور احمد اقبال نے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ اس طرح گویا یہ دو آتشہ بن گیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے ——— احمد سعید

نشانی

احمد اقبال



کتاب

کتاب کا آخری نسخہ فروخت کر کے نائلہ نے اطمینان کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ خریدار نے پھر دکان میں قدم رکھا اور سیدھا اس کی طرف آیا۔ نائلہ کا دل بیٹھ گیا۔

"دیکھیے — اگر آپ بُرا نہ مانیں تو۔۔۔ ایک سوال کروں؟"
وہ قریب آ کے جھجکتے ہوئے بولا۔

"یہی نا کہ آغاز میں جو تصویر ہے اور جس کے نام انتساب ہے وہ میں تو نہیں؟" نائلہ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"جی؟۔۔۔" اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا "جی۔۔۔ بالکل — پوچھنا تھا کہ آپ کا۔۔۔"

"میرا مصنف سے کوئی رشتہ نہیں جناب!" نائلہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میں لاہور میں رہتی ہوں اور یہاں ملازم ہوں۔ راجہ حق نواز پنڈی میں رہتے ہیں اور یہ محض اتفاق ہے کہ میری صورت ان کی والدہ سے بہت زیادہ ملتی ہے۔"

"عجیب اتفاق ہے۔۔۔" خریدار نے بے یقینی سے سر ہلا کر دروازے کا رُخ کرتے ہوئے ارشاد کیا۔

کچھ ہی دیر پہلے ایک خبطی قسم کے بزرگوار تشریف لائے تھے اور اس انکشاف پر بیہوش ہوتے ہوتے بچے تھے کہ یہ مصنف کی ماں ہے — جس کی تصویر کتاب کے حرفِ اوّل سے پہلے دی گئی ہے۔

"مگر یہ کیسے ممکن ہے خاتون۔۔۔ کتنی عمر ہے آپ کے بچے کی؟" انھوں نے بھی بے یقینی سے کہا تھا "آپ تو خود بھی کم عمر ہیں ماشاءاللہ اور یہ مصنف کا ساتواں ناول ہے۔"

"جی میرے دو بچے ہیں۔ بڑا سات سال کا ہے۔۔۔ چھوٹا پانچ سال کا۔" نائلہ نے معصومیت سے جواب دیا تھا۔

وہ پھر بے ہوش ہوتے ہوتے بچے۔ "سات سال؟۔۔۔ گویا راجہ حق نواز نے صرف سات سال کی عمر میں یہ۔۔۔ ناممکن۔۔۔"

اور نائلہ کو پھر وہ بات دہرانا پڑی جو کتاب کا چوتھا ایڈیشن ختم ہونے سے پہلے اُس نے کم از کم پانچ ہزار افراد سے کہی تھی۔ خیر اب اگلا ایڈیشن آنے تک تو سکون سے گزرے گی اُس نے تو عاجز آ کے مالک سے کہا تھا کہ اُسے اپنے سامنے نمایاں طور پر یہ لکھ کر رکھنے کی اجازت دی جائے کہ مصنف کا سیلز گرل



سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے مگر اس نے کہا تھا کہ یہ ذرا معیوب اور احمقانہ سی بات ہوگی۔ آخر خریداروں سے ایک جملے کی وضاحت کرنے میں کیا ہرج ہے۔ وہ کیسے بتاتی کہ وضاحت کرتے کرتے اُس کے اعصاب جواب دینے لگے ہیں اور سب ایک جملے سے مطمئن کہاں ہوتے ہیں۔ ایک سے ایک جھکی۔ آجاتا ہے اور اس بہانے ایک خوبصورت لڑکی کو یہ موقع فراہم کرنے والا بھی کہ چاہے تو وہ 'ہیرو' پر فریفتہ ہو جائے۔

لنچ کا وقفہ بھی ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنے معاون اور عاشقِ نامراد، دکان کے چپراسی مرادِ خان سے کہا کہ دروازے کے شفّاف شیشوں پر پلاسٹک کے حروف کی پلیٹ آویزاں کر دے جس پر لکھا ہوا تھا "لنچ بریک"۔ اُس کا دُوسرا سچا پرستار جس کا دل نائلہ کی بے رخی نے بہت پہلے بریک کر دیا تھا، کیش کلرک عیش دین تھا۔ اب اُن کی بات چیت تک بریک ہو چکی تھی۔ چنانچہ وہ لنچ بریک بھی اکیلا کرتا تھا۔ اور نائلہ کو سنانے کے لیے اکثر مرادِ خان سے کہتا تھا۔ "کیش کے بغیر عیش نہیں نامراد۔ ہم تو یہ کیش گن سکتے ہیں، اس سے سالی ایک چیز نہیں خرید سکتے۔ ورنہ دنیا میں ہر چیز بکاؤ ہے۔" اور مراد خان اُس سے سو فیصد اتفاق کرتے ہوئے سرد آہ بھر کے فرماتا۔ "سچ ہے عیش دین! بندے بھی تو بک جاتے ہیں۔" نائلہ اُن کو صاف نظر انداز کرتی تھی جو اُن کے لیے باعثِ آزار تھا۔ ہر روز کی طرح اسے اکبر اور اصغر کا خیال آیا۔ وہ بھی اسکول سے لوٹ آئے ہوں گے اور کھانا کھا رہے ہوں گے۔ معلوم نہیں وہ کالی مرچ اُن کو کتنا کھلاتی ہے اور خود کتنا کھا جاتی ہے۔ بچّے اکثر شام ہوتے ہی چلّانے لگتے ہیں۔ "ممی بھوک لگی ہے۔ ممی بھوک لگی ہے۔" اب وہ روز کیسے تفتیش کرے۔ بڑی مشکل سے تو اتنے کم پیسوں میں یہ بُڑھیا کالی مرچ ملی ہے۔ ناراض ہو گئی تو دُوسری آیا نہ جانے کب ملے اور کتنے میں ملے۔

"لارڈز" کی طرف جاتے ہوئے عقل نے ہر گام پر اسے ٹوکا کہ وہ دوسری بار زندگی کے اُسی راستے پر جا رہی ہے جس پر ایک مرتبہ ٹھوکر کھانے کا خمیازہ اسے ابھی تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اور تلخ تجربے کی ناکامی کے بعد اسے اندازہ ہو جانا چاہیے کہ معصوم صُورت چہروں والے ایسے ہی خوبصورت الفاظ کی کمند ڈالتے ہیں ایسے ہی عہد و پیمان کرتے ہیں۔ پرمسرّت خوابوں کو تعبیر دینے کے — آسُودگی کے اور تحفظ و عافیت دینے والے گھر کے — کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ نائلہ جیسی ہر لڑکی انہی خوابوں کے طلسم میں گرفتار ہوتی ہے۔ اُن کے اندر کا ہوس پرست درندہ صفت مرد وہی ایک ہوتا ہے جو حسن و شباب اور آبرو کی متاعِ بے بہا کو لُوٹ کر اپنے اصل رُوپ میں سامنے آتا ہے تو یزید بن جاتا ہے۔ اور یہ دُوسرا آدمی — یہ تو الفاظ کا جادوگر ہے۔ لفظ اس کی سب سے بڑی طاقت ہیں۔ لفظ اس کی دولت ہیں۔ سرمایۂ افتخار ہیں، اور وجۂ شہرت ہیں۔

لیکن جذبات کی شوریدہ سری نے عقل کی آواز کو دبا دیا۔ حق نواز اتنا بڑا مصنّف ہے۔ اتنی دولت کا مالک ہے اور عزت و شہرت رکھتا ہے۔ اس سے ہزار درجہ بہتر نہ جانے کتنی ہوں گی، جو اس پر مرتی ہوں گی۔ نائلہ نے بارہا دیکھا تھا کہ اچھے معزز گھروں کی کی ناز پروردہ اور حسین و جمیل لڑکیاں آٹوگراف کے بہانے اُس کی ایک نگاہِ غلط انداز کے لیے کس طرح پروانہ وار اس کے گرد منڈلا رہی ہیں اور عشوہ و غمزہ و ادا کے سارے نسوانی حربے استعمال کر لینے کے باوجود اسے تسخیر کیے بغیر ناامید جا رہی ہیں۔ نائلہ نے ہر نئی کتاب کے آتے ہی لڑکیوں کو ٹوٹ کر گرتے دیکھا تھا۔ اُن میں کالج کی لڑکیاں۔ ماڈلز۔ ملازمت پیشہ، یہاں تک کہ فلمسٹار بھی ہوتی تھیں۔ کسی ایڈیشن کے فروخت ہو جانے کے بعد اس نے مایوس لوٹ جانے والے خریداروں کی جذباتی و ذہنی کیفیت کا عکس ان کی صورت پر بھی دیکھا تھا۔ "ایک بھی نسخہ نہیں بچا؟ پلیز دیکھیے شاید کوئی کاپی ہو۔ نیا ایڈیشن کب تک آئے گا؟۔ اچھا کوئی پرانی کتاب ہو کسی کے پاس۔ آپ بھی تو پڑھتی ہوں گی اُن کے ناول۔ اگر آپ وہی کتاب مجھے عنایت کر دیں تو میں نئی کی قیمت ادا کر دوں گی۔" حق نواز جسے اشارہ کر دیتا وہ ڈال سے پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں آ گرتی۔ چنانچہ یہ بات ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ نائلہ سارا دن کتابیں فروخت کرتی تھی اور اس کام کا معاوضہ اسے ایک ہزار روپے ماہانہ ملتا تھا جو بہت غنیمت تھا۔ اگر وہ میٹرک ہوتی تو شاید اس سے آدھی تنخواہ پاتی۔ کہیں سیکریٹری یا اسٹینو بن کے اسے دو ہزار بھی مل سکتے تھے۔ لیکن اُن فرائض کی بجا آوری کے بعد جن کا تعلق دفتری یا کاروباری امُور سے نہیں ہوتا۔ یہ صاف ستھرا کام اُسے پسند تھا، جہاں اس کا بیشتر وقت کتابیں پڑھتے گزر جاتا تھا۔ وقتاً فوقتاً اسے گاہکوں کے لیے اٹھنا بھی پڑتا تھا۔ اور بڑی شائستگی سے مسکرا کے یہ بھی پوچھنا پڑتا تھا کہ انہیں کون سی کتاب مطلوب ہے۔ کچھ لوگ ایسے تھے کہ وہ گھنٹہ بھر کتابیں الٹتے پلٹتے رہتے تھے مگر بالآخر اپنی پسند کی کتابیں منتخب کر لیتے تھے۔ نائلہ انھیں پہچانتی تھی اور ان کو صرف مسکرا کر "السلام علیکم سر" کہہ دینا ہی کافی ہوتا تھا۔ لیکن وہ جو کسی مقصد کے بغیر وقت گزارنے کے لیے یا تفریح کی خاطر آ جاتے تھے۔ نائلہ کے سوال پر پھنس جاتے تھے۔ انہیں کسی نہ کسی کتاب کا نام بتانا پڑتا تھا۔ جو نائلہ انہیں ایک منٹ میں تھما دیتی تھی یا معذرت کر لیتی تھی۔ کہ مطلوبہ کتاب اُن کے پاس نہیں ہے چنانچہ دوسرے منٹ میں وہ نائلہ پر ایک لالچی نگاہ ڈال کے رخصت ہو جاتے تھے۔ ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی، یہ معاملہ ہر جگہ تھا۔ پرکشش تنخواہ اور پسند کے کام کے علاوہ مالک کے بے حد مشفقانہ اور سرپرستانہ رویے نے بھی نائلہ کو قناعت اختیار

کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور وہ خوب سے خوب تر ملازمت کی تلاش ترک کر چکی تھی۔ مالک بہت نیک دل اور شریف آدمی تھا اور نائلہ کے افسوسناک ماضی سے واقف ہونے کے بعد تو اسے بالکل اپنی بیٹی کی طرح سمجھنے لگا تھا۔ مکان چھوٹا تھا مگر اس کا اپنا تھا چنانچہ ہزار روپے نائلہ کو عزت سے رہنے کے لیے کافی تھے۔

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی۔ نائلہ نے ذہن سے اگر اسنگ عبور کر کے سوچا۔ تنہائی کا عذاب سخت ضرور تھا مگر وہ بڑی استقامت کے ساتھ اپنے دو بچّوں کے مستقبل کے لیے جدّوجہد میں مصروف تھی اور اس نے بڑی بے حسی کے ساتھ جذبات کی آگ کو بجھا دیا تھا۔ بے خواب راتوں کی پکار کو نظر انداز کر دیا تھا اور ہر نقشِ آرزو کو مٹا دیا تھا۔ بے شک خواب اس کی گرفت میں نہ تھے اور اس کے دشمن تھے مگر یہ تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا جو اب حقیقت بن کے اچانک اس کے ارادوں کی شکست کا سامان بن گیا تھا۔ اسے سب سے زیادہ حیرانی اپنی بے بسی پر ہوتی تھی۔ نہ جانے یہ کون سی قوت تھی جو اسے کشاں کشاں لیے جا رہی تھی۔ کون سا جذبہ تھا جس نے اس کی ساری مزاحمت ختم کر دی تھی اور کیا سحر تھا جس نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ حق نواز پر اعتبار کر لے۔ شاید اس کی صورت، جو کسی بھی طرح اتنے شہرت یافتہ اور دولت مند ادیب کی صورت نہ تھی۔ اس میں غرور نام کو نہ تھا لیکن وہ عجز و انکسار بھی نہ تھا جسے خوشامد سمجھا جا سکے حقیقت تو یہ ہے کہ اس پر شائستگی اور تہذیب کے پُرتصنّع جذبات کا کوئی میک اَپ تھا ہی نہیں۔ وہ ہر طرح سے ایک زمیندار تھا جو بعض اوقات غیر تعلیم یافتہ اور غیر مہذّب نظر آنے لگتا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش میں عجیب طرح کی سختی تھی۔ کچھ اکھڑ پن سے ملتی جلتی۔ لوگ کہتے تھے وہ مغرور ہے، بددماغ ہے۔ لیکن یہ اس کے انداز و اطوار کا فطری بے ساختہ پن تھا۔ وہ جیسا تھا ویسا نظر بھی آتا تھا۔ جو محسوس کرتا تھا وہ بلا تردّد بڑی بے باکی سے کہہ دیتا تھا چنانچہ نائلہ کو حیرانی ہوتی تھی کہ وہ نسوانی فطرت کے لطیف جذبات کی عکاسی میں یہ حسن کیسے پیدا کرتا ہے۔ مرد جو باہر سے سنگِ خارا نظر آتا ہو اپنی تحریر میں بریشم کی طرح نرم کیسے ہو جاتا ہے، نزاکت و رعنائی کا پیکر کس طرح بن جاتا ہے۔ اُسے پہلی بار پڑھنے والے سمجھتے تھے کہ مصنّف کوئی عورت ہے۔ خیالات و احساسات کی ایسی بھرپور عکاسی کوئی مرد کیسے کر سکتا ہے؟ مگر راجہ حق نواز خان جیسا کرخت مردانہ نام دیکھ کر تعجّب میں پڑ جاتے تھے۔ نسیم یا شمیم قسم کے نام سے واقعی پتا نہیں چلتا کہ نام کسی مرد کا ہے یا عورت کا۔ بہت سے مرد مصنّف کاروباری نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے زنانہ ناموں سے لکھتے تھے مگر یہ کبھی نہیں ہوا تھا کہ کسی خاتون نے مردانہ نام اختیار کر کے لکھا ہو۔

حق نواز وہیں سراپا شوق بنا منتظر تھا جہاں اس سے پہلے نائلہ اسے دو بار مل چکی تھی۔ نائلہ کو دیکھتے ہی وہ مسکرا کے اٹھا وہ زیادہ طویل قامت شخص نہیں تھا۔ اونچی ایڑی کی سینڈل میں نائلہ اس کے برابر آ جاتی تھی جس کا مطلب تھا کہ حق نواز ساڑھے پانچ فٹ یا ایک دو انچ اوپر تھا۔ اس کا جسم دُبلا پتلا لیکن مضبوط تھا اور اس کی جفاکشی کی زندگی کا آئینہ تھا۔ بمشکل تمام اس نے دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی۔ اور پھر تخلیق کی ایک خداداد صلاحیت سے مجبور ہو کر ایک ناول لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس سے پہلے وہ سیکڑوں ناول پڑھ چکا تھا اور یہ بات اس نے سب کے سامنے تسلیم کی تھی کہ پہلی بار کچھ لکھنے سے پہلے وہ خوفزدہ تھا۔ یہ جھجک اُس وقت دور ہو گئی جب الفاظ خود بخود اس کے ذہن میں اُترنے اور کرداروں کو جنم دینے لگے۔ حقیقی زندگی کے مشاہدات سے کہانیوں کا تانا بانا پھیلنے لگا اور اس کے قلم نے از خود ایک اسلوب اختیار کر لیا۔ پہلا ناول ایک اشاعتی ادارے کو بھیجتے وقت وہ تین ماہ تک مسوّدے پر نظرِ ثانی کرتا رہا اور معاملے کو کل پر ٹالتا رہا پھر ایک دن ہمت کر کے اس نے مسودہ ڈاک سے لاہور بھیج دیا۔ یہ کامیابی کی راہ پر پہلا سنگِ میل تھا۔ باذوق حلقوں کو ایک نئے نام نے چونکا دیا۔ اور اس پر جتنے تبصرے شائع یا نشر ہوئے سب تعریف و توصیف سے پُر تھے۔ دوسرے ناول نے تہلکہ مچا دیا اور اس کے آبائی گھر پر اخبارات و رسائل کے نمائندوں نے یلغار کر دی۔ اب وہ ملک کا مشہور ترین ادیب تھا اور رائلٹی سے اتنی دولت کما چکا تھا کہ اس کے فارم پر دو سو لوگ کام کرتے تھے۔

"میرا خیال تھا کہ تم نہیں آؤ گی۔" حق نواز نے اس کے لیے کرسی پیچھے کی اور پھر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

"کیوں؟ کس پر اعتماد نہیں تھا؟ مجھ پر یا۔۔۔ اپنے جذبۂ عشق پر؟" وہ طنز سے مسکرائی۔

"معلوم نہیں۔" وہ ہنسا۔ "لیکن حقیقت یہ ہے کہ تم نہ آتیں تو میں تم کو آفس سے اٹھا لاتا۔ زبردستی۔"

"راجہ صاحب!" وہ نظر جھکا کے بولی۔ "آپ بہت عجلت میں فیصلے کرنے کے عادی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ نے مجھے بھی سوچنے کے لیے مُہلت نہیں دی۔ اور میں اسی سے ڈرتی ہوں۔"

"دیکھو نائلہ! میں اپنی تعریف نہیں کرتا۔ لیکن لوگ میرے مشاہدے کو غلط نہیں کہتے اور میں نے تمھیں دیکھا تھا تو کوئی بات ایسی تھی جس نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں متاثر ہوا۔" اس نے کہنا شروع کیا۔ "میں نے تمھارے بارے میں کچھ معلومات حاصل کیں اور تم سے دوسری بار ملا تو تمھاری شخصیت نے مجھے واقعی مسحور کر لیا۔ صورت کے ساتھ سیرت کا حسن شرابِ دو آتشہ بن گیا۔ ورنہ تم جانتی ہو میں صرف ہوس پرست ہوتا تو میرے لیے مواقع کم نہ تھے۔ میں تم سے فلرٹ کرتا۔ اس زعم میں کہ اب تک میں نے جسے نظر کا اشارہ کیا ہے وہ اپنا سب کچھ میرے سپرد کرنے پر تیار ہو گئی ہے۔

تو تم کیا ہو۔ لیکن میں نے تم سے براہِ راست ایک سوال کیا۔ مجھ سے شادی کرو گی؟ اور مجھے آج اس کا جواب چاہیے۔"

"حق نواز صاحب! میرے دو بچے ہیں۔ میرا شوہر مجھے طلاق دے چکا ہے اور اس بات کو بھی دو سال ہو چکے ہیں۔" نائلہ نے محسوس کیا کہ آواز اس کے حلق میں پھنس رہی ہے۔ "میں نے اپنی عمر کبھی نہیں چھپائی۔ اس وقت میں چھتیس سال کی ہوں۔ میں خود اپنی نظر سے دیکھتی ہوں تو مجھے اپنے آپ میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی۔"

"یہی تو تمھاری غلطی ہے۔" وہ مسکرایا۔ "تم خود کو میری نظر سے دیکھو۔"

"اس کے علاوہ راجہ صاحب!" نائلہ نے اپنی بات جاری رکھی۔ "آپ ایک بار مجھ سے بک شاپ کے آفس میں ملے ہیں۔ بے شک میں بھی آپ کی ایک فین تھی۔ آپ کے اندازِ تحریر سے اور آپ کی عظمت سے بہت متاثر تھی چنانچہ پہلی ملاقات میں آپ سے میں نے جو کچھ کہا، وہ ایک فین کا نقطۂ نظر تھا۔ مجھ سے لاکھ درجہ بہتر لاکھوں ہیں جو آپ کی پرستش اس طرح غائبانہ طور پر کرتی ہیں۔ اور اگر ان سے بالمشافہ گفتگو ہو تو فرطِ جذبات میں وہ بہت کچھ کہہ جائیں گی لیکن میں نے آپ کو ایک مرد کی حیثیت سے پسند نہیں کیا تھا۔"

"کیا میں۔۔۔ اتنا ہی برا ہوں؟" اس نے مایوسی سے کہا۔ "اتنا بدصورت ہوں۔۔۔ یا قابلِ نفرت ہوں۔۔۔"

"میں نے یہ نہیں کہا۔" وہ جلدی سے بولی۔ "میرا مطلب تھا میں آپ پر فریفتہ نہیں ہوئی تھی۔ اگر آپ ایک عام آدمی کی طرح دکان میں آتے تو میں آپ کو نظر انداز کر دیتی۔ قابلِ پرستش وہ ادیب تھا جس کی ساتویں کتاب کا آخری ایڈیشن بھی آج ختم ہو گیا ہے۔ میں نے آپ کی مردانہ وجاہت۔۔۔ اور کشش پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ اس کا احساس تب مجھے دوسری ملاقات میں ہوا تھا جب آپ میرے گھر آئے تھے اور ہم نے دو گھنٹے ایک ساتھ گزارے تھے۔ پہلے چائے پیتے ہوئے آپ نے مجھے اپنی زندگی کے بارے میں بتایا تھا پھر آپ مجھے اور میرے بچوں کو شالیمار لے گئے تھے اور جب بچے کھیل رہے تھے تو میں نے آپ کو بتا دیا تھا کہ میں کون ہوں۔ میرا ماضی کیا تھا۔ اور مستقبل میرے لیے کیا ہے۔ آج صبح آپ نے فون پر کہہ دیا کہ مجھ سے شادی کر لو۔ اور جواب کے لیے لنچ پر بلا لیا۔ بتائیے میں کیا کروں؟"

"کچھ نہیں۔" وہ سادگی سے بولا۔ "تم ہاں کہہ دو۔ باقی انتظام میں کر دوں گا۔ تم ہاں نہیں کہو گی تو میں تمھیں جانے بھی نہیں دوں گا۔"

"عجلت میں ایک بار مجھ سے غلط فیصلہ ہو گیا تھا راجہ صاحب!" وہ بے بسی سے بولی۔ "سانپ کا کاٹا تو رسی سے بھی ڈرتا ہے راجہ صاحب۔"

"یہ کیا راجہ صاحب، راجہ صاحب لگا رکھی ہے۔" وہ چڑ کر بولا۔ "حق نواز کہتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کیا؟ تمھاری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی نا تو خوشی سے مر جاتی۔ اسے اتنا بڑا اعزاز سمجھتی اپنے لیے کہ مجھے پہلے ہاں کہہ دیتی۔ اور تم کیا سمجھتی ہو پہلے کسی نے مجھ سے نہیں کہا کہ میں اس سے شادی کر لوں؟ کبھی دیکھنا کہ میرے پاس کتنے خط پڑے ہیں اور کتنی تصویریں ہیں۔ جو ٹیلی فون دن رات آتے ہیں وہ الگ ہیں۔ وہ سب میری ادنیٰ کنیز بننے کو تیار ہیں۔ ان میں سابق وزیروں، تاجروں، صنعتکاروں اور اسمگلروں کی لڑکیاں ہیں۔ تم خود کو کیا سمجھتی ہو؟"

"میں خود کو ان کی خاکِ پا کے برابر بھی نہیں سمجھتی حق نواز۔" اس نے آنسوؤں کو روک کر کہا۔ "اسی لیے میں ڈرتی ہوں۔ مجھ میں ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے۔"

"نہیں نائلہ۔ تم میں ایسی کوئی بات ضرور ہے کہ تمھاری نظر میں میری شہرت، عزت اور دولت کچھ نہیں۔ تمھیں میرے وعدوں پر اعتبار نہیں۔" وہ دل گرفتہ لہجے میں بولا۔ "تم نے مجھے احساسِ محرومی میں مبتلا کر دیا ہے۔ خود اپنی نظر سے گرا دیا ہے۔ مجھے وہ سب لوگ جھوٹے اور مکار نظر آنے لگے ہیں جو۔۔۔ جو میرے پرستار ہیں۔"

"ایسے مت چلاؤ۔ میں نے انکار تو نہیں کیا ہے۔" وہ سہمی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔ "میں نے بتا دیا ہے نا! کہ یہ خوش قسمتی مجھے فریبِ خیال لگتی ہے۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تقدیر نے میرے لیے ایک اور پرکشش جال پھیلایا ہے۔ پہلی بار میں سخت جدوجہد کر کے ذلت و رسوائی کے اس گڑھے سے نکل آئی تھی۔ دنیا کی انگشت نمائی اور ہرزہ سرائی کا ہر زخم ابھی مندمل نہیں ہوا ہے۔ میں پھر دھوکا کھانے سے ڈرتی ہوں۔ پہلے میں اکیلی تھی۔ اب میرے ساتھ میرے دو بچے ہیں۔ اپنے ساتھ ان کو بھی سوچے سمجھے بغیر بدبختی کے اندھیرے میں دھکیلنا میرے لیے اتنا آسان نہیں۔ خدا کے لیے یہ مت سمجھنا کہ تمھاری رفاقت کو میں بدبختی کہہ رہی ہوں۔ میں خوش قسمتی کے سراب ثابت ہونے کا سوچتی ہوں تو مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔ میں مردم گزیدہ ہوں۔۔۔ ہر آدمی سے ڈرتی رہوں گی۔"

حق نواز نے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی۔ "تمھارا یہ خوف فطری ہے۔ حالانکہ تم جانتی ہو کہ خدا نے پانچوں انگلیاں برابر نہیں بنائیں۔ میں تم سے صرف وعدہ کر سکتا ہوں کہ تمھیں وہ خوشی اور تحفظ فراہم کر دوں گا جس کی تمھیں اور تمھارے بچوں کو ضرورت ہے۔ یہ پیسے کا تحفظ نہیں ہے نائلہ! جو عورت دیواروں کے گھر میں اکیلی رہتی ہے اس کے سر پر سہاگ کا سائبان نہیں ہوتا اور جن بچوں کو باپ کی شفقت کا ورثہ نہیں ملتا وہ زندگی

کے صحرا میں اُن مسافروں کی طرح ہوتے ہیں جو بادل کے سائے میں سفر کر رہے ہوں۔"

"باتیں۔ الفاظ کی شعبدہ گری۔ خوبصورت حرفوں کے جال۔ سبز باغ" نائلہ نے سوچا۔

"اگر میں قسم کھاؤں۔ تمہاری۔۔ خدا کی۔ بالحلف اٹھاؤں۔۔ تو کیا یہ ضمانت کافی ہوگی کہ میں تادمِ مرگ تمہیں اپنی رگِ جان سے بھی قریب تر رکھوں گا۔ اور تمہارے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح وہ سب کچھ دوں گا جو انہیں ملنا چاہیے تھا مگر نہیں ملا۔"

وہ کہتا جا رہا تھا۔ نہیں۔ الفاظ کی گواہی کچھ نہیں۔ الفاظ معتبر نہیں ہوتے۔"

نائلہ چونکی۔ کیا اُس نے بے خیالی میں کچھ کہہ دیا تھا؟ یا حق نواز نے اس کے خیالات کو سُن لیا تھا؟

"میں نے تمہارے اطمینان کی خاطر تھوڑا سا انتظام کیا ہے" وہ بریف کیس کھولتے ہوئے بولا۔ "میں نے اپنی زندگی کا بیمہ کرا لیا ہے۔ ایک لاکھ روپے کا۔ اگر میں حادثے کا شکار ہوا تو تمہیں دو لاکھ ملیں گے۔ اس کے علاوہ دونوں بچوں کی تعلیمی پالیسی وہ جب تک پڑھنا چاہیں گے۔۔۔ ولایت جانے تک۔۔۔ اُن کی شادی کی پالیسی اور ایک ایک لاکھ کی رقم ان دونوں کے اکاؤنٹ میں فکسڈ ڈیپازٹ جو اُن کے بالغ ہونے تک کسی کو نہیں مل سکتی اور جب اُن کو ملے گی تو دگنی سے زیادہ ہو جائے گی۔۔ میرا وصیت نامہ۔ میری خاندانی حویلی۔ باغ اور فارم۔۔۔"

"بس کرو۔۔۔ خدا کے لیے بس کرو۔" نائلہ نے اپنا سر تھام کے کہا۔ "مجھے منظور ہے۔۔۔"

"اوئے نامراد" عیش دین کی صدائے بازگشت نے کہا۔ "تو عیش وو آؤٹ کیش۔ بک گئی نا سالی۔"

نائلہ نے اس شخص کی طرح کھانا ختم کیا جو ہپناٹزم کے زیرِ اثر سوچنے سمجھنے اور محسوس کرنے کی تمام صلاحیت سے محروم ہو چکا ہو۔ حق نواز اسے اپنی سابقہ زندگی کے بارے میں بتاتا رہا۔ پھر وہ آنے والے دنوں کی باتیں کرنے لگا مگر نائلہ نے کچھ نہیں سنا وہ خوابوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ خواب جو ہنساتے تھے۔ خواب جو رُلاتے تھے۔ خواب جو بے لگام تھے۔ خواب جو سچ ہو سکتے تھے لیکن جن سے مفر نہ تھا۔

دروازے کے شیشوں سے ایک آشنا صورت کو دیکھ کر اس کے ذہن کو جھٹکا لگا۔ حق نواز اگر اپنی باتوں میں نہ کھویا ہوتا تو اس کی صورت کے تغیر کو فوراً دیکھ لیتا۔

"معاف کرنا حق نواز۔" وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں ابھی آتی ہوں۔ ایک منٹ میں۔"

حق نواز نے محض سر ہلایا۔ وہ لیڈیز ٹائلٹ کی طرف بڑھی آخری حصے میں پہنچ کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ حق نواز سگریٹ جلا رہا تھا اور اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ پلک جھپکتے میں وہ بے آواز گھومنے والے شیشے کے دروازے سے باہر آ گئی۔

"مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم لنچ کرنے یہاں آئی ہو۔ بہت اونچا اُڑ رہی ہو میری بلبل۔" حمید نے خباثت سے کہا۔

"حمید۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ میرا پیچھا چھوڑ دو۔ تمہارا اور میرا اب کوئی تعلق نہیں رہا۔ پھر تم میری زندگی میں کیوں زہر گھول رہے ہو؟" وہ رو پڑنے کے قریب تھی۔

"میں۔۔ میں۔۔۔ وہ بیٹے تو میرے ہی ہیں نا۔۔ مجھے کوئی روک سکتا ہے۔" حمید نے کہا۔

"ہاں۔ تمہیں پیسہ روک سکتا ہے۔" اس نے اپنے ہینڈ بیگ میں ہاتھ ڈالا اور سو کا ایک نوٹ نکالا۔

حمید ہنسا۔ "سو؟ آج تو تنخواہ ملی ہوگی۔ پورے ہزار ہوں گے بیگ میں۔"

"وہ ہزار تمہیں دے دوں؟ تاکہ تم شام تک سٹے میں اڑا دو۔ اور خود بچوں کے ساتھ فاقے کروں؟" نائلہ نے تیز لہجے میں کہا جس سے نفرت کے زہر کی آنچ آتی تھی۔ "تین مہینے پہلے تم میری آدھی تنخواہ لے گئے تھے۔ اور مجھے معلوم ہے ہم نے وہ مہینہ کیسے گزارا تھا۔ یہ دو سو لو اور بھاگ جاؤ۔ یہ خیرات بھی میں تمہیں اس لیے دے رہی ہوں کہ تمہارا منحوس سایہ ان بچوں پر نہ پڑے۔"

حمید نے دونوں نوٹ تہہ کر کے جیب میں رکھے۔ "اچھا میری بلبل۔ جاؤ عیش کرو۔" وہ معنی خیز طریقے پر بے شرمی سے آنکھ مار کر مسکرایا اور واپس ہو گیا۔ نائلہ نے اس کے منہ پر تھوکنے، چیخ چیخ کر اُسے گالیاں دینے اور اس کے منہ پر تھپیڑ مارنے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔ واپس حق نواز کی ٹیبل پر پہنچنے سے پہلے اس نے مناسب سمجھا کہ ٹائلٹ میں جا کر منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے۔ ٹشو پیپر سے چہرہ خشک کر کے اور ہلکے سے میک اپ کو درست کر کے وہ حق نواز کے سامنے پہنچی تو اسے انتظار کرتے بیس منٹ گزر چکے تھے۔

"معاف کرنا۔۔۔ مجھے۔۔۔ مجھے کچھ دیر ہو گئی۔" وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ "یہ۔۔۔ ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"یہ حمید تھا نا؟" حق نواز نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "کیا مانگنے آیا تھا؟۔۔۔ پیسہ؟"

خوف اور حیرت سے نائلہ کی زبان گنگ ہو گئی۔ اس نے بمشکل تمام اقرار میں سر ہلایا۔

"اور تم نے اُسے اپنی ساری تنخواہ دے دی۔۔۔ جو آج ملی تھی؟۔۔۔ کیوں نائلہ؟"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ ایک گوشے میں تھے اور لنچ کے وقفے کا رش ختم ہو چکا تھا چنانچہ ویٹر کے سوا کوئی

"اُن کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔" وہ۔۔۔ وہ اکبر اور اصغر۔۔ میں کیا کروں۔؟"

"نیلو" حق نواز نے پھر اس کے ہاتھ کو تھپکا۔ "یہ رونا بند کرو۔ تماشا بن جائے گا۔ وہ تمھیں بلیک میل کرتا ہے نا کہ تم سے بچے چھین لے گا۔ میں اس بدمعاش کا بندوبست کر دوں گا۔۔۔ تم فکر مت کرو۔ لاؤ یہ ہاتھ ادھر لاؤ۔ ایسے۔۔۔ شاباش۔" اس نے نیلو کا ہاتھ تھاما اور اُسے ایک انگوٹھی پہنا دی۔

"ویٹر۔۔۔ بل لاؤ۔" حق نواز نے پکار کے کہا۔ نائلہ ہیرے کے جگ مگ کرتے نگینے والی انگوٹھی کو دیکھتی رہی۔ "اگلے ہفتے تک ہم راولپنڈی چلے جائیں گے۔" حق نواز نے باہر آ کے کہا۔ "شادی وہیں ہوگی، ہمارے آبائی گھر میں۔ اس وقت تک تم اپنا انتظام کر لو۔ بچوں کے اسکول سے سرٹیفکیٹ لے لو۔۔۔ استعفا دے دو اور اگر ہو سکے تو یہ مکان بھی بیچ دو۔ اس کا اب کیا کرنا ہے جتنے پیسے ملیں ٹھیک ہے۔۔۔ اور اب یہ شاپ کو مارو گولی۔۔۔ ہم گھر سے بچوں کو لیتے ہیں۔ کچھ شاپنگ کریں گے، کچھ تفریح۔ اگلے ہفتے میں تمھیں لینے آؤں گا۔ چلو اب مسکراؤ۔ ہاں، ایسے۔"

راول کسی زمانے میں وہ پنڈ تھا جو راولپنڈی کی وجہ تسمیہ بنا اور وہ چھوٹی سی ندی جو اس گاؤں سے گزرتی تھی راول ندی کہلاتی تھی۔ مری جاتے ہوئے شہر سے نو میل کے فاصلے پر پتھر کی سیاہ چٹانوں جیسے پہاڑوں کے قریب ندی ایک جھیل سی بناتی تھی پہاڑ میں سے گزرنے والی چند گز کی سرنگ میں بڑا ٹھنڈا اندھیرا سا یہ رہتا تھا اور پکنک کے لیے سائیکلوں پر آنے والے نوجوان لڑکے راول ندی کے ٹھنڈے میٹھے پانی میں سارا دن نہاتے رہتے تھے۔ راول سے ذرا پہلے بائیں جانب مڑ جانے والی پتلی سی سڑک نور پور شاہاں اور بری امام کے مزار سے آگے سید پور تک جاتی تھی۔ اس کا سنگم راولپنڈی سے آنے والی دوسری سڑک سید پوری روڈ سے ہوتا تھا جو خوبانیوں اور آلوچوں کے درختوں کی سایہ دار چھت کے نیچے ایک سرسبز سرنگ لگتی تھی۔ جب اسلام آباد کا نیا شہر آباد ہوا تو راولپنڈی نے دونوں طرف پھیلنا شروع کیا اور جو مضافات کے دیہات شمار ہوتے تھے فیڈرل کیپیٹل ایریا میں شامل ہو گئے اور راول ڈیم ایک خوبصورت تفریح گاہ بن گیا۔ جس کی جھیل میں کشتیاں چلتی تھیں اور سبزہ زاروں پر جھولے دکھتے تھے۔ رات کو سیمنٹ کی درخت کے ٹھنٹھ جیسی، بنی ہوئی پول لائیٹس کا عکس اس پانی میں جھلملاتا تھا۔

حق نواز کا آبائی گھر بھی مضافات میں تھا اور مری جانے والی چھوٹی سی سڑک سے کچھ فاصلے پر پختہ اینٹوں کا بنا ہوا دو کمروں کا مکان تھا۔ اب یہ مکان ایک وسیع و عریض مگر پرانے طرز کے حویلی جیسے گھر کے پیچھے حق نواز کی اسٹڈی بن گیا تھا۔۔ دونوں خستہ حال کمروں کو مناسب مرمت اور رنگ و روغن کے بعد جدید قسم کے قالین اور فرنیچر سے آراستہ کر دیا گیا مگر ان کی ظاہری صورت وہی تھی۔ ایک کمرے میں حق نواز کی لائبریری تھی جسے عموماً مقفل رکھا جاتا تھا۔ دوسرے کمرے میں حق نواز لکھنے پڑھنے کا کام کرتا تھا۔ اور جب کام میں مصروف ہوتا تھا تو صرف کھانے کے لیے حویلی میں آتا تھا۔ چائے کافی وغیرہ کا انتظام اس نے اپنی اسٹڈی میں ہی کر رکھا تھا۔ چنانچہ کسی کو اجازت نہیں تھی کہ کام کے دوران میں مخل ہو۔ اسٹڈی اور حویلی کے درمیان تقریباً چار پانچ سو مربع گز کا لان تھا اور ماضی و حال کے دو گھروں کا رابطہ صرف ایک ٹیلی فون لائن سے تھا۔ انتہائی ہنگامی صورت میں موصول ہونے والی ٹیلی فون کال حویلی سے پرانے مکان کے فون پر منتقل کی جاتی تھی۔ کوئی ضروری بات کرنے کے لیے بھی یہی انٹرکام ٹیلی فون استعمال ہوتا تھا۔ گھر کے کسی نوکر کو لان عبور کر کے اسٹڈی میں قدم رکھنے کی سزا برطرفی کی صورت میں ملتی تھی۔

حویلی کے عقبی حصے میں نوکروں کی رہائش گاہ تھی۔ دو سرونٹ کوارٹر۔ ان میں سے ایک میں خانساماں مدد شاہ اور اس کی سوکھی چمرخ بیوی ریشم جان عرف ریشماں اپنے جوان بیٹے کرم داد کے ساتھ رہتے تھے۔ ریشماں کے بارے میں بہت سی پراسرار روایات مشہور تھیں۔ عام خیال یہ تھا کہ اس کا تعلق ارواح سے ہے اور اس پر جن آتے ہیں لیکن اس کے شوہر مدد شاہ کی رائے اس کے بالکل برعکس تھی کہ عمر زیادہ ہونے کے باعث اس کے دماغ میں جو تھوڑا بہت بھوسا تھا وہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ "ریشماں جب بھی تب بھی اب تو ٹاٹ ہے ٹاٹ۔" وہ اکثر کہتا تھا۔ "جسم کے ہر جوڑ کی طرح دماغ کے پرزے بھی ڈھیلے ہو گئے ہیں۔" ان کا جوان بیٹا کرم داد بیک وقت شوفر اور کوچوان تھا۔ گاڑی چلانے کی نوبت بہت کم آتی تھی اور حق نواز کا پھٹکا دکھتا تانگہ بھی محض شوق کی چیز رہ گیا تھا لیکن اب بھی پنڈی کے طرحدار تانگوں میں اس کی دھوم تھی۔ اس کا سفید براق ہیبل گھوڑا اپنی مستانہ چال سے لوگوں کو متوجہ کرتا تھا تو حق نواز کو ایک بھولی بسری پر غرور مسرت کا احساس ہوتا تھا یہ خوشی گاڑی میں بیٹھ کر زن سے گزر جانے میں نہیں ملتی تھی۔ حق نواز کو یہ گھوڑا اب بھی بہت عزیز تھا۔ اس کی دیکھ بھال اور مالش بھی کرم داد کے فرائضِ منصبی کا حصہ تھی۔ ریشماں باورچی خانہ سنبھالتی تھی۔۔۔ تو مدد شاہ باغ کو۔۔۔

تیسری طرف حق نواز فیملی کا قبرستان تھا جہاں بقول اس کے "میرے آباؤ اجداد آرام کر رہے ہیں۔" نائلہ توہم پرست اور بزدل قسم کی عورت نہیں تھی۔ لیکن اُسے زندہ انسانوں کے ساتھ روحوں کا مسکن بڑا عجیب لگا کیونکہ قبرستان اور گھر کے درمیان کوئی دیوار بھی نہیں تھی اور شہرِ خموشاں کی ہمسائیگی کا یہ احساس شام گہرا ہو جاتا تھا۔ جب آشیانوں کو لوٹنے والے پرندوں کا شور تھم جاتا تھا اور فضا ایک بوجھل سکوت میں ڈوب جاتی تھی۔ لاہور میں

اس کا گھر آبادی کے وسط میں نسبت روڈ پر تھا جہاں آدھی رات کے بعد بھی ٹریفک کا شور سنائی دیتا تھا۔ عادی ہونے کی وجہ سے اُن کے کان اس شور سے متاثر نہیں ہوتے تھے۔ مگر اب گرد و پیش کی ویرانی کا سناٹا اپنے تضاد سے یاد دلاتا تھا کہ وہ انسانوں کے دم سے آباد، پُررونق دنیا کی گہما گہمی سے سینکڑوں ہزاروں میل دُور خلا میں پہنچ گئے ہیں۔ آس پاس کے چھوٹے مکانوں کے رہنے والے شام گھروں میں دبک جاتے تھے۔ سورج پانچ بجے سے پہلے غروب ہو جاتا تھا اور یخ بستہ رات میں گیدڑ چلا چلا کے روتے تھے تو اکبر اور اصغر سہم جاتے تھے۔ اُن کا بیڈ روم الگ کر دیا گیا تھا جہاں اُن کی ضرورت اور آسائش کا سب سامان بھی تھا لیکن اکیلے رہ جانے کا خیال ایک خوف بن کے اُن پر سوار ہو جاتا تھا چنانچہ نائلہ ان کو سُلانے کے بعد اپنے بیڈ رُوم میں آتی تھی۔

خوف کے اس انجانے احساس میں حویلی کے اندر کی فضا کو بھی بہت دخل تھا۔ استعمال کی ہر شے پر قدامت کی مہر تھی۔ اور حق نواز کو اپنے ماضی سے ایسی جذباتی وابستگی تھی کہ وہ پُرانے وقت کے احساس کو زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ "قدامت کے حسن میں کیا طلسم ہے اور کیا رُومانس ہے۔" اس نے نائلہ کو گھر کے مختلف حصوں سے متعارف کراتے ہوئے کہا تھا۔ "یہ کوئی انگریز سے پوچھے جہاں لوئیس چہار دہم اور وکٹورین اسٹائل کا فرنیچر آج بھی وضعداری کی شان ہے اور سینکڑوں سال پرانا فرنیچر رئیسوں کے یہاں نوادرات کی حیثیت رکھتا ہے۔" لیکن اس دلیل کے باوجود نائلہ کو ماحول میں ایک آسیب زدہ گھٹن کا احساس ہُوا۔ ہر جگہ یوں لگتا تھا کہ وقت تھم گیا ہے۔ صرف ڈرائنگ روم میں پڑے فرنیچر اور قالین، سامانِ آرائش کے انداز اور لوازمات کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیسویں صدی کے عہدِ جدید میں ہیں۔ اُن کے اپنے بیڈ رُوم میں پورٹیبل ٹی وی ہی اس عہد کی علامت تھا ورنہ سب کچھ وہی تھا جو حق نواز کی ماں کے زمانے میں تھا۔ جو اُس نے خریدا تھا، اور سجایا تھا۔ حق نواز اس کی ترتیب تک بدلنے کا روادار نہ تھا اور اس سے نائلہ کو اندازہ ہوا کہ اپنی ماں سے اس کی جذباتی وابستگی کتنی زیادہ ہے۔ اُلٹا وسیع و عریض شیشم کا بنا ہوا پلنگ بھی وہی تھا جو اس کی ماں کو جہیز میں ملا تھا۔ اس کے چاروں کونوں پر مینار جیسے بیڈ پوسٹ تھے۔ اور ایک رسّی کھینچ دینے سے بیڈ کے گرد سُرخ ریشمی ساٹن جیسے پردوں کی قنات پھیل جاتی تھی۔ جس میں خلوت کا احساس اور بھی شدت اختیار کر لیتا تھا۔ حویلی میں صبح شام ہر جگہ صندل کی اگر بتیاں سُلگا دی جاتی تھیں چنانچہ یہ خوشبو ہر وقت ہر جگہ موجود رہتی تھی۔ ہر باتھ رُوم میں صندل کا صابن تھا۔ نہانے کے بعد نیلو کو سارا دن یہی خوشبو اپنے وجود سے پھُوٹتی ہُوئی محسوس ہوتی تھی۔ "میری ماں کو صندل کی خوشبو سے عشق تھا۔" حق نواز نے اسے بتایا تھا۔

اپنی آخری کتاب میں حق نواز نے ماں کی ایک تصویر بھی شامل کی تھی لیکن اپنی سابقہ چھ کتابوں کا انتساب بھی اس نے اپنی ماں کے نام ہی کیا تھا۔ جو ایک حادثے کا شکار ہو کے مر چکی تھی۔ جذباتی وابستگی کی اس شدت کا احساس نائلہ کو حویلی میں پہنچنے کے بعد ہوا جب اُس نے بیڈ رُوم میں ایک قدِ آدم روغنی تصویر آویزاں دیکھی۔ تصویر ایک مشہور مصور کے کمالِ فن کا شاہکار تھی۔ اور اس حد تک حقیقی لگتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا وہ کسی بھی وقت فریم کے چوکھٹے سے نکل آئے گی۔ اُس کی آنکھیں اتنی زندہ تھیں کہ ایک لمحے کے لیے خود نیلو کو تصویر کی جگہ آئینے میں اپنا ہی عکس نظر آیا۔ پھر اکبر اور اصغر نے مسرت سے چلا کے کہا۔ "ممی۔۔۔ آپ کی تصویر۔" تو وہ چونکی اور حق نواز قہقہہ مار کے ہنسا۔

"یہ تو تمھاری دادی ہیں بیٹا۔" اس نے ان دونوں کو بازوؤں میں سمیٹ کر اپنے قریب کیا۔ "رضیہ سلطانہ — یہ ہماری ممی ہیں۔ بالکل تمھاری ممی کی طرح۔ یہ اب جنت میں ہوتی ہیں۔"

"جنت کیا ڈیڈی؟ کیا ہم ان سے ملنے جنت جا سکتے ہیں؟" پانچ سال کے اصغر نے معصومیت سے کہا۔

"اصغر۔" نائلہ نے بے اختیار کہا تھا۔ "ایسی باتیں نہیں کرتے۔"

"خفا کیوں ہوتی ہو، اسے کیا معلوم کہ جنت کیا ہے اور آدمی کیسے مر جاتا ہے۔" حق نواز نے کہا تھا اور پھر اصغر سے مخاطب ہو گیا تھا۔ "نہیں بیٹے! ہم اُن سے ملنے نہیں جا سکتے۔ لیکن صبح ہم ان کی قبر پر پھُول چڑھانے جائیں گے، ہر صبح۔ ٹھیک؟ اب چلو۔ دیکھو تمھارے کمرے میں کیا کچھ ہے۔"

بچّوں کے کمرے میں اُن کی پسند کی اتنی چیزیں تھیں کہ وہ خوشی سے پاگل ہو گئے۔ وہ سب کھلونے جو انھوں نے دوسروں کے پاس دیکھے تھے جو ممی کے کہنے کے مطابق انھیں کبھی نہیں مل سکتے تھے، اس کمرے میں بھرے پڑے تھے۔ الماریوں میں وہ کپڑے لٹکے ہوئے تھے جو نائلہ نے گلبرگ کی عالیشان کوٹھیوں میں رہنے والے اور شاندار کاروں میں گھومنے والے بچّوں کے پاس دیکھے تھے پہلے اُس کا خیال تھا کہ اکبر اور اصغر سے حق نواز کی محبت، درحقیقت ایک ذریعہ ہے اسے خوشی دینے کا مگر اب وہ دیکھ رہی تھی کہ حق نواز کی بچّوں سے محبّت بالکل بے غرض ہے۔ اُس کا دِل پیار کا ایک گہرا ساگر تھا۔ جس کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اور جس کا کوئی کنارا نہ تھا۔ وہ نائلہ سے بھی دیوانگی کی حد تک پیار کرتا تھا اور عالمِ بے خودی میں بار بار اس سے پوچھتا رہتا تھا۔ "تم مجھے چھوڑ تو نہیں جاؤ گی نائلہ؟ — مجھ سے خفا تو نہیں ہو جاؤ گی۔ میں آدمی ہوں غلطی بھی کر سکتا ہوں۔ مجھے قتل کر دینا مگر اتنی بڑی سزا مت دینا کہ اپنا پیار مجھ سے چھین لو۔" معلوم نہیں اس کے لاشعور میں نائلہ سے بچھڑ جانے کا خوف کیسے سما گیا تھا۔ نائلہ کبھی حق نواز کو چھوڑنے کا یا اس سے خفا

ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ حق نواز نے اسے صرف محبت ہی نہیں دی تھی، مستقبل کے تحفظ کی وہ ضمانت بھی فراہم کر دی تھی جو اس کے جنونِ عشق کی دلیل تھی۔ اس نے اپنا سب کچھ نیلو کے نام کر دیا تھا۔ بچوں کے فکسڈ ڈپازٹ اکاؤنٹ کی ایک ایک لاکھ کی رقم، اُن کی ایجوکیشن پالیسی اور میرج انشورنس۔ ان سب کے عوض نائلہ کے پاس دینے کے لیے کیا تھا۔ صرف اپنی محبت۔ جو عنایات اور احسانات کے اور الطاف و اکرام کے اس بارِ گراں کے مقابل ایک بے وقعت اور بے مایہ چیز لگتی تھی۔ اپنے آپ کو کلّی طور پر حق نواز کے سپرد کر دینے اور اُسے اپنی ہر خوشی دے کر اس کے تمام غم لینے کے سوا وہ کر ہی کیا سکتی تھی۔ چنانچہ اُس نے حویلی کی فضا کو بہت خوش ہو کے اسی لیے قبول کیا تھا کہ اس سے حق نواز خوش ہوا تھا۔ اُس نے ہر دقیانوسی چیز کی کھل کر تعریف کی تھی اور اسے اپنی پسند کے عین مطابق قرار دیا تھا۔ "بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک لکڑہارے کی بیٹی تھی جو یکلخت شہزادے سے شادی کر کے قصرِ شاہی کی خوابناک طلسماتی فضا میں پہنچ گئی ہوں۔ ابھی تک مجھے اپنی خوش نصیبی کا یقین نہیں آیا ہے۔ تھوڑی سی اجنبیت کا یہ احساس مٹ جائے گا تو میں انارکلی جیسی ملکہ نورجہاں بن جاؤں گی۔" اس نے کہا تھا۔

سب سے عجیب بات شادی کے بعد پہلی رات ہوئی تھی۔ اس نے وہی عروسی جوڑا پہنا تھا۔ جس میں حق نواز کی ماں اپنے گھر سے رخصت ہو کے آئی تھی۔ تیس سال تک صندل کی لکڑی کے صندوق میں بند رہنے والے اس جوڑے میں صندل کی مہک بس گئی تھی۔ یہ ایک جذباتی مسئلہ تھا چنانچہ نائلہ نے حق نواز کی خواہش کا پورا احترام کرتے ہوئے رضیہ سلطانہ کے کپڑے پہن لیے تھے۔ اس رات اپنے بیڈروم میں پہنچ کے اُسے یوں لگا تھا جیسے حق نواز کی ماں کی تصویر کی آنکھیں اس پر مرتکز ہیں اور اُن آنکھوں کے جذبات میں مسرّت کا عکس نہیں ہے۔ حسد ہے، ملامت ہے اور نفرت ہے لیکن نائلہ نے ایک بار کے بعد دوسری بار اُن آنکھوں میں جھانکا تک نہیں۔ یہ احساس پھر بھی زندہ رہا کہ وہ آنکھیں اندھیرے میں بھی اس کو گھور رہی ہیں۔ کاش یہ تصویر یہاں نہ ہوتی۔ اس کی موجودگی شبِ عروسی کی خلوت کو اسی طرح مجروح کر رہی تھی جیسے وہ زندہ سلامت ان کی خوابگاہ میں موجود ہے۔ اس کے خیالات کے انتشار کو حق نواز نے بھی محسوس کر لیا تھا مگر نیلو اصل بات چھپا گئی تھی۔ وہ نئی زندگی کا آغاز ایک ایسی فرمائش سے نہیں کرنا چاہتی تھی جس سے حق نواز کے جذبات کو ٹھیس لگے۔ بعد میں آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ حق نواز کو منا لے گی کہ اس تصویر کو ڈرائنگ روم میں منتقل کر دے۔ وہ خلوت میں خلل کے احساس کی بات نہیں کرے گی، اسے قائل کرے گی کہ ماں کی محبت کے جذبات کو اس نے دنیا سے چھپا کیوں رکھا ہے۔ آنے جانے والوں کو بھی تو یہ شاہکارِ حسن دیکھنا چاہیے۔ پھر کبھی فوم ربر کا ڈبل بیڈ بھی آ جائے گا۔ مرد کے دل کو جیتنے کے لیے اور اپنے زیرِ دام لانے کے لیے اس کی شخصیت کے حصار میں اسی طرح نقب لگانا پڑتی ہے کہ اسے احساس بھی نہ ہو ورنہ وہ چوکنا ہو جاتا ہے۔

لیکن اس رات کے بعد صبح ناشتے کے دوران حق نواز نے کہا۔ "نائلہ! میری بات مانو گی؟ ایک التجا۔"

"یہ کیسی بات کر رہے ہو نواز!" نیلو نے سانس روک کے کہا تھا۔ "تم میرے شوہر ہو میرے محبوب ہو۔ میرے سب کچھ ہو۔ تمھارے لیے میں کیا نہیں کر سکتی۔"

"بات بہت معمولی ہے۔ محض میری خوشی۔ یا میری جذباتی حماقت۔" اس نے قدرے تامّل کے بعد کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ دن میں تم جو لباس چاہو پہنو۔ ٹیلی فون کرو اور پنڈی سے ٹیلر کو بلوا کے جدید ترین فیشن کے جتنے کپڑے بنوانا چاہو بنوا لو۔ ساریاں خرید لو۔"

"میرے پاس کپڑوں کے ڈھیر کر دیے ہیں تم نے نواز۔۔۔"

"۔۔۔لیکن رات کو۔۔۔" اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "رات کو تم وہ کپڑے پہنو گی جو میری ماں پہنتی تھی۔ تمھیں فٹ آئیں گے۔"

یہ انکشاف نائلہ پر بعد میں ہوا کہ جب تک وہ تیس سال پہلے کے نئے کہلانے والے لباس میں ہو بہو اس کی ماں نہیں بن جاتی تھی۔ حق نواز کے جذبات خوابیدہ رہتے تھے اور اس کا ردِعمل مثبت ہوتا ہی نہیں تھا۔ لیکن نائلہ کے لیے لاشعور کے مدفن سے ان یادوں کو کریدنا مشکل تھا جو اب اس کی شخصیت میں ایک نفسیاتی بحران پیدا کرنے کی ذمے دار تھیں۔ یہ تو نائلہ کو پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ رضیہ سلطانہ کا انتقال حادثے میں ہوا تھا۔ حویلی میں پہنچنے کے دوسرے دن حق نواز نے نائلہ کے ساتھ اپنی ماں کی قبر پر حاضری دی تو نائلہ کو یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ حق نواز کے والدین پہلو بہ پہلو دفن نہیں تھے۔ اس کے ساتھ والی قبر پر کوئی کتبہ ہی نہیں تھا۔

"میرے ماں باپ کی ازدواجی زندگی کو مثالی نہیں کہا جا سکتا۔" حق نواز نے تسلیم کیا۔ "وجہ اُن کی ذہنی سطح کا فرق تھا۔ میرا باپ غیر تعلیم یافتہ۔ کچھ قدامت پرست۔ تنگ نظر اور روایتی قسم کا حاسد شوہر تھا۔ اس کے برعکس میری ماں نے اس دور میں تعلیم حاصل کی تھی جب اسے انتہائی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ پھر یہ کہ وہ انتہائی آزاد خیال۔ ذہین اور حسّاس طبع تھی۔ تیس سال پہلے شادیاں والدین طے کرتے تھے۔ اور لڑکیاں صبر و قناعت کے ساتھ اُن کے فیصلے کو نوشتۂ تقدیر کی طرح قبول کرتی تھیں۔ وہ انیس سو تیس میں پیدا ہوئی تھی اور ابھی سولہ سال کی ہی تھی کہ اس کی شادی کر دی گئی۔ میں دو سال بعد پیدا ہوا تھا یعنی تقسیمِ ہند کے سال بھر بعد۔ جب میں دس سال کا ہوا تو اس کا حادثے میں انتقال ہو

گیا۔ گویا اس وقت میری ماں کی عمر بالکل وہی تھی جو اب تمھاری ہے۔ سوچو ذرا، اٹھائیس سال بھی کوئی مرنے کی عمر ہوتی ہے؟"

"کیا تم نے مجھے اپنی ماں کا نقشِ ثانی سمجھ کے چاہا ہے؟ میں نائلہ نہیں رضیہ سلطانہ ہوں؟" نیلو نے سوچا۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ملک میں پہلی بار مارشل لا کا نفاذ ہوا تھا اور ماں مجھے بتاتی جا رہی تھی کہ مارشل لا کیا ہوتا ہے اور ہم باغ میں بننے والے تالاب کی منڈیر پر چلتے جا رہے تھے میرے ہاتھ میں وہ نئی ہاکی تھی جو صرف ایک دن پہلے سالگرہ پر مجھے ملی تھی۔ تالاب میں پلستر ہو چکا تھا اور اس کے درمیان میں فوارہ بنانے کا اور پانی کے نیچے لائیٹس لگانے کا کام باقی تھا لیکن تالاب بھر دیا گیا تھا کہ نہر میں سے پانی رستا ہو تو معلوم ہو جائے مکمل ہو جاتا تو اس میں رنگین مچھلیاں بھی چھوڑی جاتیں اور کنول بھی ہوتے۔ اچانک ماں کا پیر منڈیر پر سے پھسل گیا۔ اس نے پانی میں گرنے سے بچنے کے لیے بے اختیار سہارا لینے کی کوشش کی تو اس کے ہاتھ میں سرچ لائیٹ کا وہ تار آ گیا جو کنارے پر نصب تھی۔ عارضی طور پر گھر سے تالاب تک بانس گاڑ کے بجلی کی لائن پہنچا دی گئی تھی۔ جھٹکے سے تار بانس پر سے الگ ہو گیا۔ اور جب میری ماں پانی میں گری تو لائٹ کا ہولڈر بھی اُس کی گرفت میں تھا۔ اس نے بس ایک چیخ ماری پھر میں نے ہاکی آگے بڑھائی اور چلا چلا کے کہا کہ ماں اسے پکڑ لو۔ میں تمھیں کھینچ لوں گا مگر وہ تو کرنٹ لگنے سے ایک منٹ میں مر گئی تھی۔ کرنٹ پانی میں بھی پھیل گیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں سارا قصور کرم داد کے چچا کا تھا جس نے لائٹ کا وہ عارضی انتظام کیا تھا۔ تار کو زیرِ زمین بھی تو لایا جا سکتا تھا۔" وہ خاموش ہو گیا۔ "اب تو اٹھارہ سال ہو گئے اس بات کو بھی۔"

"میں سمجھی تھی حادثے کا مطلب گاڑی کا حادثہ تھا۔" نائلہ نے ہمدردی سے کہا۔ عمداً اس نے حق نواز سے یہ نہیں کہا کہ اس کا ذہن اب تک اسی ناخوش گوار حادثے کی یاد سے متاثر ہے جب وہیں موجود ہونے کے باوجود وہ ماں کو موت کے بے رحم ہاتھوں سے نہیں چھین سکا تھا۔ شاید اسے احساس ہے کہ ماں کو بچانے کی خاطر اس نے ہاکی بڑھانے کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔ اسے تو سوچے سمجھے بغیر تالاب میں کود جانا چاہیے تھا۔ یا ماں کے گرنے سے پہلے ہی حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے ہاکی مار کے تار کو توڑ دینا چاہیے تھے۔ اور اب یہی احساسِ جرم کا ردِعمل ہے جو ماں سے دیوانگی کی حد تک جذباتی وابستگی کا سبب بن گیا ہے۔

نائلہ نے وہ کمرہ بھی دیکھا تھا جسے حق نواز نے اپنا کمرہ کہا تھا۔ نیلو کا خیال تھا کہ وہ کمرہ ویسا ہی ہوگا جیسا کسی دولتمند، خود مختار نوجوان آدمی کا کمرہ ہو سکتا ہے۔ شاندار ساز و سامان سے بھرا ہوا مگر بے ترتیبی کا شکار۔ باتصویر رسالے اِدھر اُدھر بکھرے پڑے ہوں گے۔ قالین پر بلا بیڈ پر۔ اور وہ کتابیں ہوں گی جو علم سے زیادہ آگہی حاصل کرنے کے لیے خلوتِ شب میں پڑھی جاتی ہیں۔ شاید کوئی دلنوازی کا سامان بھی ہو۔ کہیں ٹوٹی ہوئی چوڑیاں ملیں یا کسی مہمان یک شب کی خوشبو۔ کوئی تارِ پیرہن، کوئی تارِ زلف۔ مگر وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ خالی کمرے میں حق نواز کا بچپن رہ گیا تھا۔ کونے میں ایک ہاکی کھڑی تھی جو عام سائز سے چھوٹی تھی۔ لکھنے پڑھنے کی ایک چھوٹی سی میز تھی اور دیوار میں بنی ہوئی الماری میں بچوں کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک پلنگ پر اب کچھ بھی نہیں تھا۔ اس پر بچھا ہوا بستر بحفاظت کہیں رکھ دیا گیا تھا اور لحاف کے بارے میں حق نواز نے انکشاف کیا کہ آجکل وہی لحاف اُن کے زیرِ استعمال ہے جو ساٹن کے مربع ٹکڑوں کو جوڑ کر بڑی صفائی سے بنایا گیا تھا اور پھیلانے پر شطرنج کی بساط نظر آتا تھا لیکن اس میں سیاہ و سفید کے بجائے ہر رنگ تھا۔ ان کے بستر تکیے اور چادروں کے علاوہ اس لحاف میں بھی عطرِ صندل کی تیز اور حواس پر طاری ہو جانے والی خوشبو تھی چنانچہ نائلہ کو ایک مرتبہ سوتے سوتے یہ خیال آیا تھا کہ وہ صندل کی لکڑی کے تابوت میں لیٹی ہے۔

"جب میری ماں مر گئی تھی تو میں اس کمرے میں آ کے روتا رہا تھا۔" حق نواز نے بتایا۔ "اور تم اسے جو چاہو کہو مگر حقیقت یہ ہے کہ مجھے اکثر اپنی ماں کے قرب کی خوشبو محسوس ہوتی تھی۔ میں اسے اپنی آنکھوں سے اس طرح دیکھتا تھا جیسے اس وقت تمھیں دیکھ رہا ہوں۔ اور وہ اس وقت تک گود میں میرا سر رکھ کے تھپکتی رہتی تھی جب تک میں سو نہیں جاتا تھا۔"

"یہ شدید ذہنی صدمے کا غیر معمولی ردِعمل تھا۔" نائلہ نے ایک جھرجھری سی محسوس کی۔

"ہاں۔ عقل سے تو یہی وضاحت کی جا سکتی ہے۔" حق نواز نے یوں کہا جیسے اسے نیلو کے خیال سے قطعی اتفاق نہیں تھا۔ "لیکن تمھیں ایک بات اور بتاؤں۔ تمھیں یہ بات بالکل ناممکن لگے گی۔ مگر میرے سوا اس کے گواہ اور بھی ہیں۔ ہر سال اپنی برسی پر گیارہ اکتوبر کو وہ مجھ سے ملنے آتی ہے۔ اسی کمرے میں۔ دوسروں نے بھی اسے دیکھا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ اپنی زندگی میں تھی۔ وہ قبرستان کی طرف سے نمودار ہوتی ہے... اور وہاں سے سرونٹ کوارٹرز، اصطبل اور گیراج نظر آتے ہیں۔ کسی دن ہمارا بیٹا اس کمرے میں رہے گا۔"

نائلہ نے خوف کی ایک سنسنی سی محسوس کی۔ اسے یوں لگا جیسے یہ پورا گھر آسیب زدہ ہے جس میں رضیہ سلطانہ کی رُوح آج بھی موجود ہے۔ ہر وقت نگراں ہے اور ہر چیز پر قابض ہے۔ اس گھر کی مالک اور حاکم وہی ہے۔ نائلہ نہیں جو راجہ حق نواز کی شریکِ حیات ہے۔ حق نواز کی زندگی پر اس سے زیادہ تو وہ عورت اختیار رکھتی ہے جسے مرے ہوئے بھی اٹھارہ برس بیت چکے ہیں اور اب قبر میں اس کی ہڈیاں بھی خاک ہونے لگی ہوں گی۔ پہلی بار اس نے حسد، رقابت اور رنجش کے باغیانہ

جذبات کو بیدار ہوتے محسوس کیا پھر اسے اپنے آپ سے شرم محسوس ہوئی۔ اس عورت سے دشمنی کیسی جس کا وجود ہی نہیں۔ اسے تو کوشش یہ کرنا ہے کہ جس مرد سے وہ محبت کرتی ہے اس کے ذہن کو ماضی کے اس آسیب سے نجات دلا کے اپنائے۔ اس کے لیے اسے سخت جدوجہد کرنا ہوگی اور صبر و استقلال کے ساتھ۔ یہ کام بہت مشکل ہوگا مگر ناممکن نہیں ہوگا۔ وہ ابھی حویلی سے تعارف حاصل کرنے میں مصروف تھی کہ ایک معمولی حادثہ پیش آگیا۔ کرم داد نے مداخلت کرتے ہوئے ڈرتے ڈرتے اطلاع دی کہ رخشی کی ایک ٹانگ پر معمولی سا زخم آگیا ہے۔ اصطبل کا دروازہ نہ جانے کیسے کھلا رہ گیا تھا کہ وہ باہر نکل گیا اور خاردار تاروں میں الجھ گیا۔ ذرا سی دیر میں نائلہ نے حق نواز کی صورت کو ایک محبت کرنے والے شوہر، ایک مشہور ادیب اور مہذب انسان سے ایک بے رحم زمیندار، جابر انسان اور سخت گیر آقا کی صورت میں ڈھلتے دیکھا۔ غیظ و غضب سے اس کی آنکھیں انگارہ بن گئیں اور اس کا چہرہ نفرت سے مسخ ہوگیا۔ نائلہ کی موجودگی کا خیال کیے بغیر اس نے کرم داد کو گندی گالی دی اور اگر نائلہ حائل نہ ہوتی تو وہ یقیناً کرم داد کو مارتا۔ شاید کسی ہنٹر سے اس کی کھال ادھیڑ دیتا۔ اور کچھ نہیں کرتا تو اسے کھڑے کھڑے نوکری سے معزول نکال دیتا۔ کرم داد کو یقین تھا کہ اس نے ہر روز کی طرح اصطبل کا دروازہ مقفل کیا تھا مگر اس کی یہ صفائی حق نواز کے لیے قابل قبول نہ تھی۔ نائلہ نے کرم داد کو اشارا کیا کہ وہ چلا جائے۔ اور حق نواز کے غصے کی آگ کو پیار سے بجھا دیا۔

"غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے۔ اس نے پہلے کبھی کوتاہی کی ہے؟ چلو اس بار میری خاطر معاف کردو۔" نائلہ نے کہا اور پھر حیرت انگیز طور پر حق نواز کو بالکل نارمل ہو کے پرانے قالب میں ڈھلتے دیکھا۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر وہ پھر ویسا ہی ہوگیا جیسا کرم داد کے اندر آنے سے پہلے تھا۔

"مالکن۔۔۔" بڑھیا لپک کر اٹھی۔ "آؤ۔۔۔ مجھے معلوم تھا تم آؤ گی رضیہ بی بی۔"

"میں رضیہ نہیں نائلہ ہوں۔" نائلہ نے استقبال کے اس انداز پر احتجاج کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

ریشماں قہقہہ مار کر ہنسی۔ اس کی ہنسی کی آواز بہت تیز اور بے ہنگم تھی۔ ہنسی سے زیادہ ایک ہذیانی چیخ لگتی تھی۔ بالکل کسی ویرانے میں بھٹکنے والی چڑیل کی منحوس ہنسی۔ "تم خود کو کچھ بھی کہو، میرے لیے تم وہی رضیہ سلطانہ ہو۔ میری رضیہ۔ جس کے ساتھ ہی میں نے قدم رکھا تھا۔ آج تک میں اس کے ساتھ ہوں۔۔۔ اور تم۔۔۔"

"تم رضیہ کے ساتھ آئی تھیں؟" نائلہ نے سرونٹ کوارٹر کے دروازے کی دہلیز میں رک کر کہا۔

"ہاں۔ میں نے اس کو اپنی گود میں کھلایا تھا۔ اس کو ماں کی گود سے لے کر اتنا بڑا کیا تھا۔ جتنی تم ہو۔" بڑھیا نے کھوکھلی آواز میں کہا۔ "جب وہ دلہن بنی۔۔۔ تو میں اس کے ساتھ ہی آگئی کیونکہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔"

"کیوں۔۔۔ تمہارا اپنا بیٹا بھی تو تھا۔ کرم داد۔۔۔ اور تمہارا شوہر تھا۔"

"شوہر۔۔۔ مددشاہ۔۔۔ اس کو میں نے بتا دیا تھا کہ میں اسے چھوڑ سکتی ہوں۔۔۔ رضیہ کو نہیں۔۔۔ وہ کیا کرتا۔۔۔ وہ میرے ساتھ آگیا۔۔۔۔ کرم داد تو بعد میں ہوا تھا۔۔۔ اور اس میں کوئی بھی تو بات ایسی نہیں تھی جو میری رضیہ میں تھی۔ میری بڑی آرزو تھی کہ میری اپنی بھی ایک بیٹی ہو۔۔۔ بالکل رضیہ جیسی۔ خدا نے میری آدھی دعا قبول کی۔ مجھے بیٹی تو دی مگر وہ کرم داد کی طرح تھی۔ خدا اسے۔۔۔ اب میں اسے کیا کہوں معلوم نہیں وہ زندہ بھی ہے کہ نہیں۔۔۔ میں اسے دعا دوں کہ بددعا۔ بیٹیاں تو ماں پر جاتی ہیں۔ حق نواز کو نہیں دیکھا تم نے۔۔۔ ہے نا اپنی ماں کی تصویر۔۔۔"

اس انکشاف نے نائلہ کو سُن کر دیا۔ یہ بات خود اس نے نوٹ کیوں نہیں کی۔ حالانکہ مشابہت کا یہ احساس تو ایک ہی نظر میں ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی ماں کا روپ ہے۔۔۔ وہی ناک نقشہ۔ وہی تیکھے نقوش۔ اکہرا بدن۔۔۔ سنہری آنکھیں۔۔۔ جو سطح جھیل کی طرح ساکت مگر ساگر کی طرح گہری لگتی ہیں۔ ہر وقت کسی سوچ میں گم۔۔۔ اور ہلکے بھورے سیاہ بال۔۔۔

"تمہاری اپنی بیٹی۔۔۔" نائلہ نے سنبھل کے کہا۔ "کیا وہ

گئی تھی...؟" عمداً اس نے فرار کا لفظ استعمال نہیں کیا۔

"نہیں... وہ بھاگ گئی تھی۔ ابھی وہ سترہ سال کی تھی کہ جوانی اس پر ٹوٹ کر آئی... اس کے قابو سے باہر ہو گئی... جیسے برساتی ندی میں باڑھ آتی ہے..." ریشماں نے اسی سپاٹ لہجے میں کہا۔ "وہ خوبصورت تھی... بہت خوبصورت تھی... معلوم نہیں اب وہ کہاں ہے... مددشاہ کہتا ہے، وہ مر گئی... ہمارے لیے مر گئی... مگر میرا دل کہتا ہے کہ وہ ایک دن ضرور ملے گی... اسی زمین پر کہیں نہ کہیں... لڑکیاں جو گھروں سے نکل جاتی، کہاں جاتی ہیں...؟"

اس غیر متوقع سوال نے نائلہ کو بوکھلا دیا۔ "میں... میں کیا بتا سکتی ہوں ریشماں۔ ہو سکتا ہے اس نے کسی سے شادی کر لی ہو اور اپنے بچوں کے ساتھ اپنے گھر میں آباد ہو..." اس نے ریشماں کی تسلی کے لیے کہا۔ وہ کیسے کہتی کہ عین ممکن ہے وہ کسی قحبہ خانے کی زینت ہو۔ اپنا سب کچھ لٹا کے کسی سڑک پر بھیک مانگ رہی ہو۔ یا زیرِ خاک کسی مرقدِ بے نشاں میں گم ہو چکی ہو۔ اس کے پرستار آشنا... دلال... اس کا نام تک بھول چکے ہوں نائلہ ایک پلنگ کی پٹی پر ٹک گئی۔

"...اس کی روح کو میں نے کبھی نہیں دیکھا..." ریشماں اب بھی بول رہی تھی... "تمہیں معلوم ہے خدا نے مجھے ارواح سے رابطہ قائم کرنے کی صلاحیت دی ہے... کوئی بھی مجھ پر یقین نہیں کرتا..."

"اماں..." کرم داد نے دروازے میں نمودار ہو کے تہدیدی لہجے میں کہا۔ "پھر وہی بک بک شروع کر دی ہے۔"

"اسے بک بک کہتے شرم نہیں آتی کمینے..." ریشماں چلائی "میں ماں ہوں تیری... اور کیا خود تو نے نہیں دیکھا ہے، رضیہ کو اس گھر میں آتے جاتے۔ بتا پچھلی برسی پر کیا ہوا تھا؟ مجھے جھوٹا ثابت کرنا چاہتا ہے جھوٹے..."

"آپ میرے ساتھ آ جائیں..." کرم داد نے سکون سے کہا۔ "ورنہ ماں کا یہ دورہ شدت اختیار کر جائے گا۔"

نائلہ نے باہر آ کے اطمینان کا سانس لیا۔ ریشماں اب بھی چلا رہی تھی کرم داد کو کوس رہی تھی۔ اپنی بیٹی کو کوس رہی تھی اور اپنے مقدر کو کوس رہی تھی۔ ساری دنیا کو پاگل کہہ رہی تھی جو اسکو پاگل کہتی تھی۔

"میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ آپ کی وجہ سے مجھے راجہ صاحب نے جوتے مار کر نہیں نکالا..." کرم داد نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "ان کی طرح آپ بھی یقین کریں یا نہ کریں لیکن میں جانتا ہوں کہ میں نے اس دن بھی اصطبل میں تالا لگایا تھا۔"

"چھوڑو اس بات کو..." نائلہ نے کرم داد کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ پونے چھ فٹ قد کا اور تقریباً اس کا ہم عمر کرم داد ملازم ہونے کے باوجود شوقین مزاج تھا۔ رنگین ٹی شرٹس اور کارڈرائے کی ٹائٹ پتلونوں کے ساتھ جاگر ٹائپ جوتے پہنتا تھا اور صورت کے علاوہ لہجے سے بھی تعلیم یافتہ اور مہذب لگتا تھا۔ اس نے اعتراف بھی کیا کہ میٹرک کے بعد وہ کالج میں داخل ضرور ہوا تھا لیکن سال بھر بعد جب سیکنڈ ایئر میں تھا تو فیس ادا نہ کرنے کے باعث اس کا نام خارج کر دیا گیا تھا۔

"راجہ صاحب... تم نے ان سے کہا ہوتا... وہ تمہاری فیس بھر دیتے..." نیلو نے کہا۔ "وہ بہت فراخدل آدمی ہیں۔"

کرم داد طنز سے ہنسا۔ "وہ بہت بڑے آدمی ہیں... بہت مشہور ادیب اور پرانے جاگیردار... ان کے دونوں مزاج الگ الگ ہیں بیگم صاحبہ۔ آپ نے اس کا نمونہ تو دیکھ ہی لیا ہے۔ ہم نوکر اور مزارع ایسی جرأت نہیں کر سکتے... وہ زمیندار پہلے تھے۔ یہ دولت انہی زمینوں سے اگی ہے جس میں کسانوں کا خون پسینہ شامل ہے... جس کا حق محنت بھی ان کو پورا نہیں ملتا۔" وہ بات کرتے کرتے یک لخت رک گیا۔ اسے احساس ہوا کہ حق گوئی و بے باکی آئینِ جواں مرداں ضرور ہے مگر جس سے وہ بات کر رہا ہے وہ حق نواز کی بیوی ہے۔

"ڈرو نہیں... میں ان سے کچھ نہیں کہوں گی..." نائلہ نے کہا۔ "تم مجھے اچھے آدمی لگتے ہو..."

کرم داد کا چہرہ مسرت سے روشن ہو گیا۔ نائلہ نے پرستاری کے جذبات اس کی آنکھوں میں پہلے ہی دیکھ لیے تھے مگر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ عمر کا تقاضا تھا اور کچھ نائلہ کے حسن کی قوتِ تسخیر کا بھی مگر بظاہر اس نے آخری جملے کا غلط مطلب نکالا تھا۔

"کرم داد... میں یہاں اجنبی ہوں... تم سب کے بعد آئی ہوں۔" نائلہ نے اپنی بات جاری رکھی۔ "رفتہ رفتہ میں سب جان لوں گی لیکن بہت سی پرانی باتیں ہیں۔ جو تم نے اپنے والدین سے سنی ہوں گی... یا دیکھی ہوں گی۔ جن کا تعلق میرے شوہر کی ذات سے ہے۔ مثلاً مجھے معلوم ہے کہ نواز کو اپنی ماں سے کتنی شدید جذباتی وابستگی تھی... اور ہے... لیکن اس نے کبھی اپنے باپ کا ذکر نہیں کیا۔ رضیہ سلطانہ کے شوہر کا!"

کرم داد مسکرایا اور یہ مسکراہٹ اتنی عجیب تھی کہ نائلہ اسے حیرانی سے دیکھتی رہی مگر اس کا کوئی مطلب نہ نکال سکی۔

"کون سے شوہر کا بیگم صاحبہ...؟" وہ ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کے کھڑا ہو گیا۔ "آپ اجازت دیں تو سگریٹ جلا لوں؟"

نائلہ نے آہستہ سے سر ہلایا اور گھاس پر بیٹھ کے ایک تنکا چبانے لگی۔ "تمہارے سوال سے میرے سوال کا جواب نہیں ملتا۔"

"بیگم صاحبہ..." کرم داد نے سگریٹ کا ایک کش لے کر کہنا شروع کیا۔ "میں کانوں سنی اور آنکھوں دیکھی... سب بتا دیتا ہوں۔ راجہ صاحب کی ماں رضیہ سلطانہ بڑے گھر کی بیٹی تھیں۔ یہ حویلی انہی نے بنوائی تھی جو زمین آج راجہ صاحب کی کہلاتی ہے وہ بھی انہی کی چھوڑی ہوئی ہے۔ راجہ صاحب تو ایک معمولی دکاندار

کے بیٹے تھے۔ غالباً ان کے والد کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ رضیہ سلطانہ والدین کی اکلوتی تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ بیٹی کبھی گھر سے رخصت نہ ہو۔ جو بھی اس سے شادی کرے رخصت ہو کر ان کے گھر آجائے۔ اور حق نواز صاحب کے والد سے شادی ایسے ہی حالات میں ہوئی تھی۔ میں نے سنا ہے کہ خود رضیہ سلطانہ کسی اور کو چاہتی تھیں لیکن وہ زمانہ ایسا تھا کہ لڑکیاں اپنی پسند سے شادی تو کیا والدین کو اپنی پسند سے آگاہ تک نہیں کر سکتی تھیں اور ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ان کا پہلا شوہر ایک جاہل۔ اُجڈ قسم کا آدمی تھا۔ انتہائی تنگ نظر، حاسد اور بیوی کو عورت سمجھتا ہی نہیں تھا۔ اس نے رضیہ سلطانہ کو عملاً قید کر رکھا تھا۔ یہ چار دیواری دیکھ رہی ہیں نا آپ۔ اسے بارہ فٹ تک اونچا کرانے والا بھی وہی تھا۔ اس کے اوپر تاروں کی باڑ بھی اسی نے لگوائی تھی اور یہ سب کچھ اس نے رضیہ کے والدین کے انتقال کے بعد کیا۔ جب وہ بلاشرکتِ غیرے سب کا مالک بن چکا تھا۔ رضیہ کا بھی اور اس کی جائداد کا بھی۔ وہ مکار آدمی اسی دن کے انتظار میں تھا۔ رضیہ پڑھی لکھی عورت تھی اور یہ جو لکھنے لکھانے کا شوق ہے یہ بھی راجہ صاحب کو اپنی ماں سے ورثے میں ملا ہے۔"

"کیا... ؟" نائلہ نے بے اختیار کہا۔ "وہ بھی لکھتی تھیں؟ کس نام سے۔ میں نے ضرور پڑھا ہوگا ان کو اگر وہ کوئی مشہور مصنفہ تھیں۔"

کرم داد ہنسا۔ "وہ مصنفہ تھیں... مشہور بھی ہو سکتی تھیں، مگر وہ زمانہ اور تھا۔ اس زمانے میں عورتوں کا پڑھنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ جس گھر میں "عصمت" اور "تہذیبِ نسواں" جیسے پاکیزہ رسالے آتے تھے وہ بھی بدنام ہو جاتا تھا کہ اس گھر کی عورتیں شریف نہیں۔ عشق و محبت کی کہانیاں پڑھتی ہیں۔ حالانکہ عشق و محبت کی کہانیاں تو الف لیلیٰ میں بھی ہیں۔ لیلیٰ مجنوں۔ یوسف زلیخا۔ مثنوی زہرِ عشق۔ ساری اردو شاعری میں اور کیا ہے؟"

"تم نے تو مجھے حیران کر دیا۔ میں سمجھتی تھی کہ کورس کی کتابوں کے سوا تم نے کچھ نہیں پڑھا ہوگا۔"

"اور گھوڑے کی مالش یا کار کی پالش کے سوا کچھ نہیں کیا ہوگا؟" وہ تلخی سے مسکرایا۔ "آپ ایسا سوچنے میں حق بجانب ہیں بیگم صاحبہ رضیہ سلطانہ نے اپنے وقت میں جو کچھ لکھا نا قابلِ اشاعت تھا۔ آج کے معیار پر وہ بڑی صاف ستھری کہانیاں سمجھی جاتیں لیکن اس وقت ہر عورت عصمت چغتائی بننے کی ہمت نہیں رکھتی تھی اور بات ہمت کی نہیں اجازت کی تھی۔ شوہر نے تو ان کے لکھنے پر بھی قدغن لگا دی تھی کہ اس سے خیالات گمراہ ہوتے ہیں۔ ان کی اشاعت کا کیا سوال۔ وہ سب مسودے خاک ہوئے۔ میں نے سنا ہے ان کو رضیہ سلطانہ کے ساتھ ہی دفن کر دیا گیا تھا۔ آپ کو معلوم ہے ان کی شادی سولہ سال میں کر دی گئی تھی۔ اٹھائیس سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ مگر ان کے پہلے شوہر یعنی حق نواز صاحب کے والد کا انتقال شادی کے دس سال بعد ہو گیا تھا۔ رضیہ سلطانہ نے یہ دس سال جہنم میں قیدِ بامشقت کی طرح کاٹے تھے۔ عدت کا زمانہ پورا ہوتے ہی انہوں نے دوسری شادی اس شخص سے کر لی تھی جس کو وہ چاہتی تھیں اور ان کا دوسرا شوہر واقعی اس دور کا مجنوں تھا۔ وہ دس سال بعد بھی کنوارا بیٹھا تھا اور اس نے شادی کا ارادہ ہی ترک کر دیا تھا لیکن تقدیر اس پر مہربان ہوئی بھی تو بہت تھوڑے سے دنوں کے لیے... دو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ رضیہ ایک حادثے میں ہلاک ہو گئی۔ اس وقت وہ دوسرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اس کے دوسرے شوہر کا دماغی توازن اس صدمے سے بگڑ گیا۔ وہ سب کچھ چھوڑ کے رضیہ کی قبر کا مجاور بن گیا اور پھر ایک روز غائب ہو گیا۔

'اور غالباً اسی لیے رضیہ سلطانہ کی قبر کے ساتھ کسی شوہر کی قبر نہیں۔' نائلہ نے واپس آتے ہوئے سوچا۔ 'لیکن وہ مدفنِ بے نشان جس پر کسی کا نام نہیں۔۔۔ وہ کس کا ہے؟ رضیہ کے پہلے شوہر کا؟ اس کا نام اپنے نام کے ساتھ نہ لکھ کر رضیہ نے دس سال کی مظلومی کے احساس کو بھی ختم کرنا چاہا تھا؟'

"اُدھر کہاں گئی تھیں؟" حق نواز نے اس کے اندر قدم رکھتے ہی پوچھا۔

"کہیں نہیں۔۔۔" نائلہ نے اس کے شک آمیز لہجے پہ حیران ہو کے کہا۔ "ریشماں کے کوارٹر میں تھی۔۔۔"

"تم جھوٹ بولتی ہو۔۔۔ گھنٹہ بھر سے تو تم اس ہیرو کرم داد کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔" حق نواز نے اسی لہجے میں کہا۔

"ہاں، تم نے دیکھا ہے تو جھوٹ کیسے ہو سکتا ہے۔" نائلہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "وہ مجھے اس حویلی اور باغ کے بارے میں بتا رہا تھا۔"

حق نواز کا چہرہ ذرا سی دیر کے لیے سُرخ ہوا۔۔۔ پھر اس نے جذبات پر قابو پا لیا۔ "یہ نوکر لوگ ہیں۔۔۔ ان کو زیادہ منہ لگانا ٹھیک نہیں۔۔۔ ان کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔۔۔ اس کی ماں کا دماغ تو ہے ہی۔۔۔"

"حق نواز۔۔۔ اگر میں انسانوں کو انسان سمجھ کے ان سے بھی بات نہ کروں تو کیا کروں؟" نائلہ نے تنک کر کہا۔ "یہاں تو وقت کاٹے نہیں کٹتا۔۔۔ تم صبح اپنی اسٹڈی میں گھستے ہو تو دوپہر کے بعد کھانے کے وقت نمودار ہوتے ہو۔۔۔ دوپہر کو سو کے اٹھتے ہو تو خطوں کے جواب دینے بیٹھ جاتے ہو۔۔۔ نہ ہم کسی سے ملنے جاتے ہیں۔۔۔ نہ یہاں کوئی ملاقاتی آتا ہے۔۔۔ تم جیسا مشہور آدمی اس طرح گوشۂ گمنامی میں کیسے رہ سکتا ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔ ہم تو بازار تک نہیں جاتے۔۔۔ بس فون پہ آرڈر چلتے ہیں۔۔۔"

حق نواز مسکرایا۔ "اگر میں ایسا نہ کروں تو صبح سے شام تک میرے مداح اور اخبار والے۔۔۔ نقاد اور پبلشر سب مل کر مجھے ایک منٹ کی مہلت نہ دیں۔۔۔ میں نے بڑا سخت رویّہ اختیار کر کے ان

سب کی حوصلہ شکنی کی۔ اب بھی جو آتا ہے اسے میرے آفس سے میرا اسکریٹری لوٹا دیتا ہے۔ براہ راست کوئی مجھے فون تک نہیں کر سکتا۔ لیکن تمھارا شکوہ بجا ہے۔ تمھیں اپنی مصروف زندگی کے بعد یہاں تنہائی کا احساس زیادہ ہوگا۔ اتفاق سے آج میرے ایک دوست ڈاکٹر یوسف کے بچے کی سالگرہ ہے۔ اکیلا تھا تو میں اس قسم کی دعوتوں میں شرکت سے گریز کرتا تھا۔ مگر شام کو ہم ضرور چلیں گے۔"

ڈاکٹر یوسف کی پارٹی میں نائلہ کی ملاقات بہت سی خواتین سے ہوئی جو سب کی سب معزز، معقول اور تعلیم یافتہ تھیں۔ تین ڈاکٹروں، دو وکیلوں اور ایک پروفیسر کی بیویوں نے نائلہ کو گھیرے رکھا ان سب کے لیے نائلہ کی تقدیر باعث رشک تھی۔ جسے حق نواز جیسے مشہور مصنف نے اتنی جلدی پسند کر کے رفیق حیات بنا لیا۔

"وہ تو شادی کے لیے بات تک کرنے پر رضامند نہ ہوتے تھے" وکیل کی بیوی نے کہا "ایک سے ایک رشتہ مل سکتا تھا"

"اور اب آپ سے کیا پردہ۔" ایک ڈاکٹر کی بیوی نے آہ بھر کے کہا "میری اپنی چھوٹی بہن لاکھوں میں ایک تھی۔ حق نواز پر مرتی تھی"

"اس پر تو میں بھی مرتی تھی۔" دوسرے ڈاکٹر کی زیادہ بے تکلف اور خوش مزاج بیوی نے ہنس کر کہا۔ "بلکہ اب بھی مرتی ہوں۔ مگر اب صرف اس کی تحریر پر۔ مگر یہ سچ ہے کہ اس کو لاکھوں میں ایک بھی پسند آئی ہی نہیں۔ مثلاً میں۔" وہ ہنسی۔

وہ سب خوبصورت تھیں۔ محفل میں اور بھی غیر شادی شدہ نوعمر قسم کی جذباتی لڑکیاں تھیں جو پروانہ وار اس کے گرد جمع تھیں۔ نائلہ سب کچھ دیکھتی رہی اور سب کی سنتی رہی لیکن اس نے کسی قسم کا حسد یا رقابت کا جذبہ محسوس نہیں کیا۔ حق نواز اب اس کا تھا اور اس کے لیے یہی اعتماد کافی تھا۔ اسے متعدد خواتین نے مدعو کیا۔ بعض نے بڑے اصرار اور خلوص کے ساتھ اور بعض نے رسماً۔ اگلے ہفتے میرے بھائی کی منگنی ہے۔ منگل کو میرے بچے کا عقیقہ ہے۔ کل محفل میلاد ہے۔ ضرور آیئے گا۔ وعدہ کیجیے۔ وہ سب سے وعدہ کرتی رہی۔ ایسی سوشل لائف اس کی خواہش کے عین مطابق تھی۔ لیکن اس کے بعد آنے والے دو ہفتوں میں وہ تین بار صدر تک شاپنگ کیلئے اور گھومنے پھرنے ضرور گئے مگر کسی سے ملاقات کے لیے نہیں۔

حق نواز نے کہا تھا! "یہ عورتیں۔ خدا ان سے بچائے۔ جہاں دو اکٹھی ہوں گی تیسری کی برائی کے سوا کوئی بات نہیں کریں گی۔ ادھر کی بات ادھر۔ کسی کے بارے میں رائی کا پتا چل جائے۔ یہ پہاڑ بنا کے پیش کر دیں گی۔"

"لیکن نواز وہ سب تعلیم یافتہ اور معقول عورتیں تھیں۔"

"عورت اور معقول۔" حق نواز نے قہقہہ مار کے بات ختم کر دی تھی: "نامعقولیت میں اَن پڑھ اور پڑھی لکھی سب برابر۔ سوائے تمھارے۔"

"یہ تو بڑے تعصب کی بات ہے۔" نائلہ نے کہا تھا۔ "آخر وہ سب بھی تو آپس میں ملتی ہی ہیں۔"

"بھئی ان کے شوہر فارغ ہیں۔" حق نواز نے کہا تھا۔ "یہ وکیل اور پروفیسر یا ڈاکٹر قسم کے لوگ چند گھنٹے کام کرتے ہیں۔ اور بس۔"

"اچھا تو تم کام کرو اپنا۔ میں تعلقات عامہ کا شعبہ سنبھال لوں گی۔"

"نہیں جان۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ تم اور میں کہیں ایک ساتھ نظر نہ آئیں اور لوگ جو بے پر کی اڑاتے ہیں، کہنے لگیں کہ ہمارے تعلقات میں کشیدگی آگئی ہے۔" حق نواز نے کہا تھا اور نائلہ خاموش ہو گئی تھی کیونکہ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب صاف یہ تھا کہ میں تم کو اکیلا کہیں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ انھوں نے "سیرز" میں آئس کریم کھائی۔ نائلہ نے "لندن بک کمپنی" سے کچھ کتابیں خریدیں۔ پھر وہ بچوں کے لیے کپڑے کھلونے خریدتے رہے اور رات کو اسلام آباد کے "شہرزاد" میں کھانا کھا کر گھر آئے۔ بچے بہت خوش تھے مگر نائلہ سوچ رہی تھی کہ کیا وہ بھی اب اس حویلی میں اسی طرح اسیر ہو گئی ہے جیسے بہت پہلے رضیہ سلطانہ تھی؟ کیا تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی؟

جس دن حمید کا فون آیا وہ حویلی کے کمروں کی خاموشی میں سہمی سہمی سی بولائی ہوئی پھر رہی تھی۔ بچوں کو ان کی آیا اور گورنس مس شہلا، بابا بلیک شیپ پڑھا رہی تھی۔ آواز پہچانتے ہی خوف سے اس کا دل بیٹھ گیا۔ "اب تم نے کیوں فون کیا ہے۔" وہ سخت لہجے میں بولی۔

"مجھے تم سے ایک کاروباری بات کرنا ہے۔" وہ عیاری سے بولا "تم نے وہ مکان بیچ دیا۔ ساٹھ ہزار میں۔ حالانکہ وہ مکان میرا بھی تھا۔ مجھے اپنے حصّے کے تیس ہزار چاہئیں۔"

"تم... کہاں ہو...؟" نائلہ نے تھوک نگل کے کہا۔ "مجھے اپنا پتا بتا دو۔ میں تمھیں بنک ڈرافٹ بنوا کر بھیج دوں گی۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میری بلبل۔" وہ بولا۔ "میں تمھارے بہت قریب ہوں۔ خود لینے آسکتا ہوں۔"

"اگر تم نے۔ تم نے قدم بھی رکھا اس گھر میں۔" غصے سے اس کا حال برا ہو گیا۔

"کیا تم مجھے روک سکتی ہو؟" وہ چیلنج کرتے ہوئے بولا "میں اپنے بچوں سے ملنے آرہا ہوں۔ قانونی طور پر۔"

"قانونی طور پر تم نے اپنی کون سی ذمّے داری پوری کی ہے؟" نائلہ نے برہمی سے کہا۔ "ان کا خرچ دیا ہے۔؟"

"تم اس کا دعویٰ دائر کر سکتی ہو۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "فیصلہ ہوگا تو دیکھا جائے گا۔ لیکن آج اسی وقت قانون کی کسی دفعہ کے تحت مجھے اپنے بچوں سے ملنے سے روکنا تمھارے بس میں نہیں ہے

میری بلبل —"

"دیکھو — میں نے اور تم نے اتفاق رائے سے علیحدگی کا فیصلہ کیا تھا۔" وہ التجا کرتے ہوئے بولی۔" اور ہم نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ تم بچوں پر اپنے حق کا دعویٰ نہیں کرو گے اور میں تم سے ان کا خرچ نہیں لوں گی — تم نے حق نواز سے بھی کہہ دیا تھا کہ تم بچوں کے حقِ ملکیت سے دستبردار ہونے کے لیے تیار ہو۔ پھر اب میری زندگی کی خوشیوں کے دشمن کیوں ہو رہے ہو۔؟ میری راہوں میں انگارے کیوں بچھا رہے ہو۔؟"

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔" وہ رکھائی سے بولا۔" میں صرف اپنا حق طلب کر رہا ہوں — تیس ہزار نقد — بچوں کے حقِ ملکیت سے دستبردار ہونے کا فیصلہ قطعی نہیں تھا۔"

"اچھا خدا کے لیے میری اتنی بات تو مان لو کہ آج کے بجائے کل صبح آجاؤ — دس بجے — اس وقت نواز اپنی اسٹڈی میں ہوگا۔ ابھی تو وہ آنے والا ہے۔" نائلہ نے منت کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا بلبل — تم بھی کیا یاد کرو گی — ہم تمہاری درخواست منظور کرتے ہیں —" وہ ہنسا۔ فون بند ہو گیا۔

کس کا فون تھا؟" حق نواز نے اس کے پیچھے آکے کہا۔

نائلہ یوں چونک کر پلٹی جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔

"وہ — حمید — حمید کا —" اس نے محسوس کیا کہ عذرِ گناہ، بدتر از گناہ نہ ہو جائے — جھوٹ بولنا ناممکن تھا۔

"اس کا اب تم سے کیا تعلق —؟" حق نواز کے ماتھے پر ناگواری کی ایک شکن نمودار ہوئی —

"وہ — وہ دراصل — بچوں سے ملنا چاہتا تھا — میں نے کہا نواز سے بات کرو —"

"اس بدمعاش کا اب بچوں سے بھی کیا تعلق ہے —" حق نواز نے برہم ہو کے کہا۔" پہلے صرف تم نے ان کی پرورش کا بار اٹھایا اور وہ الٹا تم سے مانگ کر کھاتا رہا — اب بچوں کا ذمے دار میں ہوں۔"

"وہ کہتا ہے اس نے حقِ ملکیت سے دستبرداری کا فیصلہ بدل دیا ہے۔" نائلہ نے ہمت کر کے کہا۔

"میں اسے گولی مار دوں گا۔" حق نواز نے پھنکار کے کہا۔ "فیصلہ صرف ایک بار ہوتا ہے۔ اس نے قانونی دستاویزات پر دستخط کر دیے ہیں — جتنا پیسہ اس نے مانگا تھا میں نے دے دیا۔ اولاد کو بیچ دینے والا بے غیرت باپ کس منہ سے ایسی بات کر سکتا ہے —؟"

نائلہ حیرت سے پتھر کے بت کی طرح کھڑی رہی —" دستخط۔ قانونی طور پر — !تم نے اسے پیسہ دیا تھا؟"

"ہاں — کتے کو تو ہڈی ہی ڈالنا پڑتی ہے — ورنہ وہ بھونکتا رہتا ہے —" حق نواز نے نفرت و حقارت سے کہا۔" اس نے ہی بیس ہزار مانگے تھے۔ دس دس ہزار میں دونوں بیٹے فروخت کیے تھے — اور کیا کہہ رہا تھا —"

"— اور — اور کیا —... اپنے حصے کے تیس ہزار مانگ رہا تھا — مکان ساٹھ ہزار میں فروخت ہوا تھا نا —"

"وہ بیس ہزار سٹے میں اڑا دیے ہوں گے —" حق نواز نے تلخ لہجے میں کہا۔" معلوم نہیں ایسے شخص کو تم بات کرنے کے قابل کیوں سمجھتی ہو — اس سے کہنا تھا کہ جاؤ، عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ صاف انکار کرنا تھا —"

"مگر یہ تو اس کا حق ہے نا —" نائلہ نے اپنے دفاع میں کہہ دے کر بات ختم کرنا بہتر ہے —"

"بات یہ ہے کہ تمہیں اب بھی اس کا خیال ہے۔" حق نواز نے طنز سے کہا۔" اور کچھ نہیں —" وہ پلٹا اور نائلہ کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

اس نے اطمینان اور عدم اطمینان کے درمیان خود کو دو ٹکڑے ہوتے محسوس کیا۔ جھوٹ بول کے اس نے اچھا ہی کیا تھا ورنہ اگلے دن صبح دس بجے حق نواز یقیناً موجود رہتا اور صورت حال نہ جانے کیا ہو جاتی — لیکن اس جھوٹ کے باوجود حق نواز کے ردِعمل نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا — کیا وہ اتنا حاسد اور شکی مزاج ہے؟ 'اب بھی' کا کیا مطلب؟ خود میں نے تو حمید کو فون نہیں کیا تھا مگر اس رات نواز نے اپنے رویے پر معافی مانگ لی — "میں انتہائی جذباتی آدمی ہوں نائلہ — خصوصاً تمہاری محبت کے معاملے میں — مجھے کبھی غلط نہ سمجھنا — عشق کی انتہا ایسی ہی دیوانگی ہوتی ہے۔" اس نے کہا تھا اور نائلہ کے دل پر سے ایک بوجھ اتر گیا تھا۔ معمول کے مطابق صبح انھوں نے ایک ساتھ ناشتہ کیا — پھر بچوں کی اسکول بس نے ہارن دینا شروع کیا۔ اکبر اور اصغر بستے اٹھا کے نکل گئے — حق نواز اس سے باتیں کرتا رہا — ہر روز کی طرح نو بجے وہ اسٹڈی میں نہیں گیا۔ نائلہ صبر و سکون کے ساتھ بالکل نارمل رہنے کی بھرپور جدوجہد کرتی رہی — سوا نو بجے اس نے بے چینی سے گھڑی دیکھی — ساڑھے نو بجے اس کے اعصاب کشیدگی کا شکار ہونے لگے — غیر ارادی طور پر اس نے پانچ پانچ منٹ کے وقفے سے دو مرتبہ کلائی کی گھڑی کو ٹھیک کرنے کے بہانے سے وقت دیکھا — دس بجنے میں پانچ منٹ۔ اف! میرے خدا — اگر وہ آپہنچا تو میں حق نواز سے کیا وضاحت کروں گی — میری کون سی وضاحت اسے مطمئن کرے گی کہ خود میں نے فون کر کے حمید کو نہیں بلایا تھا۔ اور باقی سب جھوٹ تھا — بچوں سے ملاقات اور تیس ہزار دینے کی بات —

"جانِ من —" وہ چلتے چلتے دروازے میں رک گیا۔" کیا تم اس خبیث کو واقعی تیس ہزار دینا پسند کرو گی۔ جس کے بارے میں اچھی طرح جانتی ہو کہ وہ ساری رقم جوئے میں یا سٹے میں ہار جائے گا؟"

"میرے چاہنے کی بات نہیں نواز — تیس ہزار اسی کے ہیں۔

وہ جو چاہے کرے — ہماری طرف سے جہنم میں جائے ہمیں کیا۔"
نائلہ نے کہا: "بقول تمھارے کُتّے کے آگے ہڈی نہ ڈالی جائے تو وہ بھونکتا رہتا ہے۔"

وہ ہنسا: "ہاں — تم ٹھیک کہتی ہو — لاؤ مجھے دے دو وہ رقم۔ میں اسے بنک ڈرافٹ بنوا کر بھجوا دیتا ہوں۔"

"ایسی جلدی کیا ہے؟" نائلہ نے پھر گھڑی دیکھی جس میں دس بجنے ہی والے تھے — "اور — اس نے اپنا پتا بھی تو نہیں بتایا تھا۔"

دس بج کر پانچ منٹ پر حق نواز نے اسٹڈی کا دروازہ بند کیا اور دس بج کر دس منٹ پر ایک ٹیکسی پورچ میں آکھڑی ہوئی — بڑی عجلت میں نائلہ نے وہ ہینڈ بیگ اٹھایا جس میں تیس ہزار کی رقم وہ پہلے ہی رکھ چکی تھی اور باہر نکل کر ٹیکسی میں بیٹھ گئی — "بیٹھو —" اس نے حمید کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا: "میں یہاں تم سے بات کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی — میں اپنے شوہر سے بہت ڈرتی ہوں — صدر چلو —" اس نے ڈرائیور سے کہا جس نے بڑے معنی خیز طریقے سے پلٹ کے دیکھا تھا۔

"میں ہرگز تمھیں پریشان نہ کرتا میری بلبل —" اس نے ٹیکسی کے روانہ ہوتے ہی نائلہ کا ہاتھ تھام لیا۔ نائلہ نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا — وہ خفت سے مسکرایا: "دراصل — میرے حالات اچھے تو خیر کبھی نہیں رہے — اتنا بدقسمت نہ ہوتا — تو تمھیں پا کے کیوں کھوتا — اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے — مجھے نوکری سے جواب مل گیا ہے — اس میں میرا کوئی قصور نہیں — میں کمپنی کی چالیس سالہ مالکن کا پالتو شوہر بننے کو تیار نہ تھا — مجھ پر دو ماہ کا کرایہ واجب الادا ہو گیا تھا — مالک مکان کے غنڈوں نے میرا سامان باہر پھینک دیا — میرا دنیا میں کوئی دوست نہیں — ایک تم مہربان تھیں — میں بے غیرت، بے شرم — ذلیل اور کمینہ ہوں نائلہ — لیکن میں تمھیں اب بھی چاہتا ہوں — یہ جانتے ہوئے بھی کہ تمھیں پھر پانا تو کیا تمھاری آرزو کرنا بھی گناہ ہے — سارا قصور میرا تھا — اب مجھے اس کی سزا مل رہی ہے۔"

"تمھیں نواز نے بیس ہزار روپے دیے تھے — اور تم نے بچوں پر حقِ ملکیت سے دستبرداری کے کاغذات پر دستخط ......"

وہ ہنسا: "وہ — .. وہ دستخط تم نے دیکھے ہیں؟ میرے دستخط تو پہچانتی ہو نا تم — میں نے جانتے بوجھتے غلط دستخط کیے تھے ... اس کے بیس ہزار میں واپس اس کے منہ پر مار سکتا ہوں — بچے میرے ہیں۔"

"حمید!" نائلہ خوفزدہ لہجے میں چلائی — "تم اُسے نہیں جانتے۔ وہ تمھیں گولی مار دے گا — اس نے خود کہا ہے ... اور اگر اس نے نہ ماری تو میں تمھیں قتل کر دوں گی — کسی خوش فہمی میں مبتلا مت رہنا۔ محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے — محبت پہلے تھی — اب جنگ کا آغاز تم کر رہے ہو —" ڈرائیور نے سر گھما کے دیکھا — "چلتے رہو۔" نائلہ نے ڈرائیور سے سخت لہجے میں کہا: "سیدھے مال روڈ پر۔"
ٹیکسی پلازہ سے ریڈیو پاکستان کی طرف دوڑنے لگی۔

"یہ لو اپنے تیس ہزار —" اس نے بیگ کھول کے سو سو کے نوٹوں کی تین گڈیاں حمید کی گود میں ڈال دیں: "اب میرا تمھارا حساب ختم — اور تعلق بھی — آیندہ کبھی بات کرنا ہو تو میرے شوہر سے کرنا۔"

حمید نے تشکّر اور احسان مندی کے جذبات کا اظہار کرنے کی غلط کوشش کی۔ نائلہ کا طمانچہ اس کے منہ پر پڑا۔
"ٹیکسی روکو —" اس نے چیخ کر ڈرائیور کو حکم دیا: "اسی جگہ — ورنہ آگے چوک پر پولیس مین کھڑا ہے — اس کے ساتھ تم بھی اغوا کے الزام میں پھنس جاؤ گے —" ٹیکسی کے بریک جام ہو گئے۔
"گیٹ آؤٹ!" اس نے چلّا کر کہا۔

"ٹھیک ہے!" حمید نے نائلہ کے تیور دیکھتے ہوئے کہا: "میں سمجھ لوں گا تم سے بھی — اور تمھارے اس تیس مار خان سے بھی —" اس نے اتر کے ٹیکسی کا دروازہ دھڑ سے بند کیا۔

"واپس چلو —" نائلہ نے پُرسکون لہجے میں ڈرائیور کو حکم دیا — تقریباً ایک گھنٹے بعد ٹیکسی نے پھر اُسے پورچ میں اتار دیا۔ نائلہ نے سو کا نوٹ ڈرائیور کو دیا۔ سر کی ہلکی جنبش سے اس کے سلام کا جواب دیا جو بخشش کے نام پر یہ رشوت ملنے کی وجہ سمجھتا تھا۔ نائلہ نے اپنے بیڈ روم میں قدم رکھا اور منجمد ہو گئی — حق نواز بستر پر لیٹا کسی رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

"کہاں سے آ رہی ہو؟" اس نے رسالے پر سے نظر ہٹائے بغیر سپاٹ لہجے میں کہا۔

"میں — ذرا ڈاکٹر کے پاس گئی تھی — .. طبیعت کچھ متلا رہی تھی!" نائلہ نے کہا — اس کا خیال تھا کہ شاید یہ جھوٹ اسے اچھا لگے —

"ابھی تو تم ٹھیک تھیں — میرے اسٹڈی میں جانے سے پہلے —" وہ طنز سے بولا: "کس ڈاکٹر کے پاس ہو آئیں؟"

"میں کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں گئی —" نائلہ نے اپنے غصّے کو ضبط کرتے ہوئے کہا: "طبیعت راستے میں ٹھیک ہو گئی تو میں لوٹ آئی — لیکن تم نے آج کچھ لکھا نہیں؟ تم اتنی جلدی کیوں آ گئے — اپنی اسٹڈی سے میری نقل و حرکت کی نگرانی بھی کرتے ہو کیا —؟"

"کیا مجھے اس کا حق حاصل نہیں ہے؟" وہ اُسی سپاٹ لہجے میں بولا: "تم میری بیوی ہو آخر —"

"ہاں ہے — مگر مجھے بھی بیوی کی حیثیت سے اتنا حق ضرور حاصل ہے کہ بیمار ہو جاؤں تو ڈاکٹر کے پاس چلی جاؤں — تمھارے ایسے سوالات سے مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں یہاں نظر بند ہوں۔"
نائلہ نے بے خوفی سے کہا: "تمھارے لہجے سے مجھے —..."
وہ ہنس پڑا — "ان کو آتا ہے پیار پر غصّہ — ہم کو غصّے پر پیار آتا ہے —" اس نے رسالہ پھینک کر کہا: "میں تو صرف اس لیے پوچھ رہا تھا کہ مجھے تمھارے اکیلے جانے پر ندامت تھی — میں اپنے کام میں تم کو بھول گیا — تمھیں ذاتی کار کے ہوتے ہوئے ٹیکسی میں

جانا پڑا۔"

نائلہ کا دل دھک سے رہ گیا۔" تو تم نے یہ بھی دیکھا تھا کہ میں ٹیکسی میں گئی تھی۔۔ نمبر بھی نوٹ کیا ہوگا تم نے؟"

"جان۔۔ بس اب غصہ تھوک دو۔۔ دیکھو نا میں اور کیا اندازہ کر سکتا ہوں۔۔ جب گاڑی گھر میں کھڑی ہے تو کیا تم پیدل گئی ہوگی۔ چلو آئی ایم سوری۔۔،" وہ اس کی طرف بڑھا۔

کانٹے کی ایک نوک سی اس کے دل میں ٹوٹ کر رہ گئی تھی جس کی خلش ایک عذابِ مسلسل تھی۔ کیا حق نواز جانتے بوجھتے جھوٹ بول رہا ہے۔۔ اس نے یقیناً جمید کو بھی دیکھ لیا ہوگا جو ٹیکسی سے اتر کر باہر کھڑا ہو گیا تھا۔

رات کو اس کے سر میں شدید درد اٹھا، بارہ بجے حق نواز نے اپنے دوست ڈاکٹر یوسف کو فون کیا۔

"بھابی۔۔ یہ درد آپ کو پہلے بھی ہوا ہے؟" یوسف نے اُسے دیکھنے اور دوا دینے کے بعد کہا "کوئی دورہ۔۔"

"دورہ؟ نہیں۔۔ دورہ تو نہیں۔۔،" نائلہ نے آنکھیں بند کر کے کہا۔" سال چھ مہینے میں ایک آدھ بار ایسا ہوتا ہے۔۔ اب تو دو سال بعد یہ شکایت ہوئی ہے۔۔ جب میں سولہ سال کی تھی یوسف بھائی۔۔ تو لاہور سے قصور جاتے ہوئے بس کو حادثہ پیش آ گیا تھا۔ میرے اپنے والدین اسی حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے۔۔ میرے سر میں چوٹ آئی تھی۔۔ میں دو دن بے ہوش پڑی رہی۔۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ دماغ کی چوٹ خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔۔ مگر اس کا اثر عارضی رہا۔ تقریباً چھ ماہ تک میری یادداشت کمزور رہی تھی۔۔ کوئی بات یاد نہیں رہتی تھی۔۔ لوگوں کے چہرے دیکھ کر نام یاد نہیں آتے تھے۔ سڑکوں کے موڑ بھول جاتی تھی۔ پوچھنا پڑتا تھا کہ آج تاریخ کیا ہے اور دن کیا ہے۔۔ پرانے واقعات تو بالکل ذہن میں نہیں آتے تھے۔۔ اس سے زیادہ پریشانی یہ ہو گئی تھی کہ میں ڈراؤنے خواب دیکھتی تھی۔۔ اور سوتے میں چلنے لگی تھی۔۔ رات کو نہ جانے کس کس کمرے میں ہوتی تھی۔ چھت پر جا کر سو جاتی تھی۔ صبح کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا۔۔ چھ مہینے بعد حادثے کے اثرات زائل ہونے لگے۔۔ سال بھر بعد میں بالکل نارمل ہو چکی تھی۔۔ یہ سر درد کے دورے بھی اسی کا نتیجہ تھے۔۔ ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ خود بخود ختم ہو جائیں گے۔۔"

"آئی سی۔۔،" یوسف نے خاموشی کے طویل وقفے کے بعد کہا۔

"خیر۔۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔۔ میں چلتا ہوں۔"

"آج تک مجھے تم نے کبھی یہ بات نہیں بتائی تھی۔۔" حق نواز نے ڈاکٹر یوسف کے جانے کے بعد نرمی سے کہا۔

"۔۔ یہ۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔۔۔؟" اس نے بمشکل تمام آنکھیں کھولیں "کوئی موقعہ بھی تو نہیں آیا تھا۔۔"

"اور کیا باتیں ہیں۔۔۔ جو بتانے کا موقع نہیں آیا؟" حق نواز کی آواز بہت دور سے آئی۔۔ سکون آور دوا کا اثر نائلہ پر غالب آنے لگا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیا حق نواز نہیں جانتا کہ مجھے اس وقت غمگساری، تیمارداری اور سکون کی ضرورت ہے۔۔ طنز کے اس تلخ زہر کی نہیں۔۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو سورج بہت اوپر آ چکا تھا۔ اس کے ساتھ والے تکیے پر پن سے ایک کاغذ لگا ہوا تھا۔ "میں ایک پبلشر سے ملنے لاہور جا رہا ہوں۔۔ گیارہ کو ملن کی برسی ہے۔ اس سے پہلے ہی واپس آؤں گا۔"

آٹھ۔۔ آج آٹھ تاریخ ہے یا سات۔۔۔ کیلنڈر دیکھنے پر نائلہ حیران رہ گئی۔۔ آج چھ تاریخ ہے۔۔ چھ تاریخ کو مجھے تنخواہ ملا کرتی تھی۔۔ ایک ایک تاریخ شمار کرنا پڑتی تھی۔۔ اب تاریخ اور دن غیر اہم ہو گئے ہیں۔ وقت تھم گیا ہے۔۔ صبح ہوتی ہے۔ شام ہوتی ہے۔۔ عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے۔۔ ایک سرد آہ بھر کے اس نے کاغذ کو چرمُر کر کے کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔۔ اب تم بتاؤ کہ یکلخت لاہور جانے کا پروگرام کیسے بن گیا۔ تم نے تو رات تک ذکر بھی نہیں کیا تھا مجھ سے۔۔!

ناشتہ کر کے وہ ننگے پاؤں باہر نکل آئی۔۔ لان پر ابھی تک شبنم کی نمی باقی تھی۔۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے سرونٹ کوارٹر تک گئی اور لوٹ آئی۔۔ پھر اس نے کرم داد کو دیکھا اور فیصلہ کیا کہ حق نواز کی عدم موجودگی میں کیوں نہ وہ ان سب سے مل آئے جن سے ڈاکٹر یوسف کے بچے کی برتھ ڈے پارٹی میں ملاقات ہوئی تھی۔۔

"گاڑی کی چابیاں تو راجہ صاحب اپنے ساتھ لے گئے ہیں بیگم صاحبہ۔" کرم داد نے یوں کہا جیسے نائلہ کا تمسخر اڑا رہا ہو کہ بی بی۔۔ تم اتنی ناسمجھ تو نہیں ہو۔ کیا اب تک تمہیں اندازہ نہیں ہوا کہ اپنی مرضی سے آنا تو تمہارے اختیار کی بات تھی مگر یہاں سے نکلنا تمہارے خداوندِ مجازی کے حکم کے بغیر ناممکن ہے۔۔

"میں تانگے میں جاؤں گی۔۔ گھوڑا گاڑی تیار کرو۔۔،" نائلہ کو جیسے ضد ہو گئی کہ وہ نظر بندی کے احکامات کی خلاف ورزی ضرور کرے گی۔ "گھوڑے کی ٹانگ کا زخم ابھی ٹھیک نہیں ہوا بیگم صاحبہ۔" کرم داد نے مؤدبانہ عرض کی۔۔

"اچھا تو جاؤ ٹیکسی لے کر آؤ۔" نائلہ نے برہمی سے کہا۔

"میں معافی چاہتا ہوں بیگم صاحبہ۔۔ راجہ صاحب کہہ گئے تھے کہ آپ کی طبیعت۔۔۔ کچھ ٹھیک نہیں ہے۔۔،"

احساسِ ذلت سے نائلہ کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔۔ اور اس کے کانوں کی لوئیں دہکنے لگیں۔۔ حق نواز یقیناً بتا گیا ہے کہ بیگم صاحبہ کے ذہن پر ایک پرانی چوٹ کا اثر ہے۔۔ اور سمجھنے والے سمجھ گئے ہوں گے کہ بیگم صاحبہ پر پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں۔۔ ان کو باہر نہ جانے دیا جائے۔۔" یہ اس خاندان کی روایات معلوم ہوتی ہیں کرم داد۔" وہ خفت سے ہنسی۔ شاید۔۔ راجہ صاحب کی ماں زیادہ خوش قسمت تھیں۔۔ قیدِ حیات و بندِ غم۔۔ اصل میں دونوں ایک ہیں۔"

"موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں ۔۔۔ یہی کہنا چاہتی ہیں نا آپ ؟" کرم داد نے کہا۔ "آپ کے خیال میں زندہ رہنے والوں کو اسی بزدلانہ فلسفے پر قانع رہنا چاہیے ۔۔۔ میرا اندازہ بالکل برعکس ہے بیگم صاحبہ ۔۔۔ رضیہ سلطانہ سے زیادہ بدقسمت عورت کوئی نہیں تھی ۔۔۔ پہلے شوہر اور پھر بیٹے نے مل کر اسے مار دیا۔ ایک نفرت کو نہ برداشت کر سکا اور دوسرا محبت کو ۔۔۔"

نائلہ ہکا بکا کھڑی کرم داد کی صورت دیکھتی رہی۔ "بیٹے نے ؟ ... بیٹے نے ماں کو مار دیا ؟ اس بیٹے نے جس سے زیادہ محبت کسی ماں سے کسی بیٹے نے نہیں نبھائی ۔۔۔"

"بیگم صاحبہ !" کرم داد مسکرایا۔ "محبت کی انتہا نفرت کے ردِعمل کا نتیجہ بھی تو ہو سکتی ہے ۔۔۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔"

"بیٹھو ۔۔۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔" نائلہ نے گھاس کے سرسبز تختے پر بیٹھ کے کہا۔ "تم ضرورت سے زیادہ ذہین ہو کرم داد ۔۔۔ یہاں کیوں خوار ہو رہے ہو ؟ گھوڑے کی مالش اور شوفر کے کام میں کیا ہے کہ تم اپنی ذہانت اور قابلیت کو تباہ کر رہے ہو ؟ تم جوان اور باہمت ہو ۔۔۔ ماشاء اللہ تندرست بھی ہو ۔۔۔ تم بہت ترقی کر سکتے ہو ۔"

کرم داد اُسے دیکھتا رہا اور گھاس کا ایک تنکا چباتا رہا۔

"سوچا تو میں نے بھی بہت تھا ۔۔۔ اور فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ میں اس پاگل خانے سے نکل جاؤں ۔۔۔ لیکن آپ نے ... میرا مطلب ہے ابھی میں کہیں نہیں جا رہا ہوں ۔۔۔"

آپ نے ؟ ؟ کیا کرم داد کہنا چاہتا تھا کہ آپ کی وجہ سے ؟ نائلہ کے ذہن میں یہ سوال نہ جانے کیوں آ گیا ۔۔۔ بے شک کرم داد اس کا بہترین دوست ثابت ہو رہا تھا ۔ معاون ۔۔۔ رازدار اور قابلِ اعتماد تھا۔ لیکن صرف ذہنی سطح کی حد تک ۔۔۔ کہیں وہ کسی خوش فہمی میں تو مبتلا نہیں ہو رہا ہے ؟ "اچھا چھوڑو اس بات کو۔ تم نے ابھی کیا بات کہی تھی ۔۔۔ مجھے سمجھاؤ ذرا ۔۔۔"

"سمجھ تو آپ بھی سکتی ہیں ۔۔۔" وہ بولا۔ "ذہین آپ بھی کم نہیں ۔۔۔ میں آپ کو صرف واقعات بتا دیتا ہوں ۔۔۔ پھر آپ جو نتائج اخذ کرنا چاہیں کریں ۔۔۔ راجہ صاحب اپنے باپ کا نقشِ ثانی ہیں۔ ان کی ماں نے دس برس تک ان کے والد سے صرف نفرت کی تھی۔ کیا راجہ صاحب نے ہوش سنبھالنے کے بعد اس نفرت کو محسوس نہیں کیا ہوگا ؟ جو بظاہر کامیاب نظر آنے والی ازدواجی زندگی کا المیہ تھی۔ جسے کوئی المیہ نہیں سمجھتا تھا ۔۔۔ پہلے شوہر کی موت کے بعد رضیہ سلطانہ نے دو سال تک صرف محبت کی ۔۔۔ لیکن کس سے ؟ اس شخص سے جو راجہ صاحب کے والد کا رقیب تھا۔ جو اس لیے راجہ صاحب کی ماں کی محبت پر قابض ہوا کہ موت نے راجہ صاحب کے باپ کو اس حق سے محروم کر دیا تھا ۔ جیسے یہ حق زندگی میں بھی نہیں ملا تھا ۔۔۔ راجہ صاحب نے دیکھا کہ ان کی ماں دس سال تک دل کے مدفون خزانے کی متاعِ محبت ایک اجنبی کے سپرد کر چکی ہے ۔ حق تلفی راجہ صاحب کے والد کی ہوئی تھی ۔۔۔ راجہ صاحب کی ہوئی تھی ۔ اور جب رضیہ سلطانہ نے اس غاصب کی وجہ سے خود راجہ صاحب کو نظر انداز کرنا شروع کیا تو یہ احساس شدت اختیار کر گیا کہ ماں نے اسے خوشی سے نہیں مجبوری کے تحت جنم دیا تھا ۔ اس کی محبت اور مامتا سب مجبوری تھی ۔۔۔ شاید یہ احساس بے بنیاد بھی نہیں تھا ۔ راجہ حق نواز نفرت کا ثمر تھا ۔ اس نے والدین کی نفرت کے سائے میں پرورش پائی تھی ۔۔۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ بہت جلد محبت کے گلشن میں ایک پھول کھلنے والا ہے جس کے ساتھ وہ ایک خار دار کیکٹس کی طرح رہے گا ۔ گھروں میں پھولوں کے گملوں کے ساتھ کیکٹس بھی تو سجائے جاتے ہیں ۔ مگر کیکٹس کی کوئی خوشبو نہیں ہوتی ۔۔۔ اس کا رنگ کوئی نہیں دیکھتا ۔۔۔ اور یہ پھول اسی زمین میں نمو پا رہا تھا جس نے اسے مجبوری میں پروان چڑھایا تھا ۔۔۔ یہ زمین کا قصور تھا جس نے اس پر ظلم کیا تھا ۔ اس کے ساتھ ناانصافی کی تھی ۔۔۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ زمین سے اس نفرت کا انتقام لے گا جو اس کے لہو میں زہر بن کے شامل ہو گئی تھی ۔۔۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ تالاب کی منڈیر پر چل رہا تھا ۔ تالاب میں پانی تھا اور حق نواز خان کے ہاتھ میں ایک ہاکی تھی ۔ اگر آپ آگے چل رہی ہوں اور میں پیچھے سے آپ کی ٹانگ ہاکی سے کھینچ لوں تو کیا آپ توازن برقرار رکھ سکیں گی ۔ خصوصاً اس وقت جب آپ بے خبری میں اعتماد اور اطمینان کے ساتھ باتیں کرتی جا رہی ہوں ۔۔۔ اور اگر آپ کو تیرنا بھی نہ آتا ہو ۔۔۔ رضیہ سلطانہ کا ہاتھ بدقسمتی سے بجلی کے تار پر پڑ گیا ۔۔۔ قصور وار میرا چچا ٹھہرا جس نے بجلی کی لائن دیتے ہوئے احتیاط کے تقاضوں کو نظر انداز کیا۔"

نائلہ کا دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔ "تم ... تم کہہ رہے ہو کہ حق نواز نے خود اپنی ماں کو قتل کیا تھا ؟ جانتے بوجھتے ۔ اس لیے کہ وہ ۔ اس کے باپ کی لاش پر نوحہ کرنے کے بجائے محبت کے گیت گا رہی تھی ۔ اس کے رقیب کے لیے ؟"

"میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی بیگم صاحبہ ۔ میں اپنی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ دہرا سکتا ہوں ۔ نتیجہ آپ اخذ کر رہی ہیں۔" کرم داد نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

"اور ۔۔۔ یہ ۔ حق نواز کی یہ محبت ۔ ماں سے یہ جذباتی وابستگی کی انتہا ۔" نائلہ نے سانس روک کر پوچھا۔

"کچھ لوگوں کو بار بار ہاتھ دھونے کی عادت ہوتی ہے۔" وہ کسی فلسفی کی طرح بولا۔ "میں نے کسی رسالے میں پڑھا تھا کہ ان کے لاشعور میں غلاظت کا احساس رہتا ہے ۔ وہ سمجھتے ہیں انھوں نے کوئی غلیظ کام کیا تھا ۔ انھیں لوگ بہت صفائی پسند کہتے ہیں۔ اگر قاتل کو اپنے ہاتھ خون میں بھرے ہوئے نظر آتے ہوں تو وہ بھی یہی کرے گا ۔ بار بار صابن سے ہاتھ دھوئے گا ۔ دنیا سے زیادہ خود اپنے آپ کو فریب دینے کے لیے ۔ احساسِ جرم و ندامت

کارِ عمل کیا ہو سکتا ہے۔ آپ نے وہ کمرہ دیکھا ہے جس میں راجہ حق نواز کا بچپن سولی پر چڑھا ہوا ہے؟"

"ہاں... وہاں ایک آلۂ قتل بھی رکھا ہے۔" نائلہ نے بے خیالی میں کہا۔ "ایک ہاکی...۔"

"رات کو میری ماں نے رضیہ سلطانہ کو پھر دیکھا تھا۔" وہ گھاس پر دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کے لیٹ گیا۔ "اس نے ہمیشہ کی طرح رضیہ کو قبر سے اُٹھ کے گھر کی طرف آتے دیکھا اور اس نے مجھ سے بھی دیکھنے کو کہا۔"

"اور تم نے کیا دیکھا...؟" نائلہ نے غور سے کرم داد کی صورت دیکھی۔

"وہی جو میری ماں نے دیکھا تھا۔" وہ آسمان کی گہرائی میں پرواز کرنے والے پرندوں کو دیکھتا رہا۔ "وہ دروازے سے اندر داخل ہوئی... اس کے کپڑے... اس کی صورت کے نقوش سب واضح تھے... پھر وہ اوپر نظر آئی۔ آپ کے بیڈ روم میں... کھلی ہوئی کھڑکی سے... کمرے میں روشنی تھی اس لیے میں صاف دیکھ سکتا تھا...۔"

"تم بھی مجھے دہشت زدہ کرنا چاہتے ہو؟" نائلہ چلائی۔

"میں نے اپنی ماں کو جھٹلا دیا۔" وہ بولتا گیا۔ "میں نے کہا سب تمہارا وہم ہے ماں۔ وہم کا شکار میں بھی ہو سکتا ہوں۔ روح کے وجود سے مجھے انکار نہیں لیکن روح کے مادّی وجود کو میری عقل تسلیم نہیں کرتی۔ ارواح کو دنیا کے معاملات میں دخل در معقولات کی کیا ضرورت ہے... مگر سراب... فریبِ نگاہ... خواب... ان سے کون انکار کر سکتا ہے۔ جادو کی وضاحت تو سائنسدان بھی نہیں کر سکتے... آپ نے کل میری ماں کو ایک شال دی تھی؟"

"ہاں... پرانی شال تھی۔" نائلہ نے تسلیم کیا۔ وہ کہنے لگی۔ "تم بالکل رضیہ ہو۔ فراخ دل اور مہربان۔ میرا دل نہیں مانتا کہ تم رضیہ نہیں ہو۔ سچ بتاؤ تم رضیہ ہو یا نہیں؟ میرے انکار پر اس نے شال قبول نہیں کی تھی...۔"

ایک ٹیکسی اندر آ کے رُکی تو کرم داد ایک دم اٹھ کے کھڑا ہو گیا... حق نواز نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا اور بریف کیس لے کر سیدھا اندر چلا گیا۔ اس کا رویہ اس کے دلی جذبات کا آئینہ دار تھا۔

"تم دو ہی دن میں آ گئے...؟" نائلہ نے شگفتگی سے کہا۔

"ہاں... تمھیں بہت افسوس ہو رہا ہے۔ پھر یہ مسکراہٹ کا پردہ کس لیے؟" وہ بے رحم لہجے میں بولا۔ "بڑا رومانٹک پوز تھا۔"

"نواز... عقل کی بات کرو... وہ ایک معمولی نوکر ہے۔" نائلہ نے چلا کے کہا۔

"نوکر... سابق شوہر... ڈاکٹر... میرے دوست... میں نہیں چاہتا کہ تم کسی سے ملو... میرے بغیر کہیں جاؤ... مجھے یہ بھی گوارا نہیں کہ کوئی تمھیں نظر بھر کے بھی دیکھے۔ تم میری ہو... صرف میری... تمھارے وجود پر... تمھارے جسم پر... تمھاری روح پر... سب پر صرف میرا اختیار ہونا چاہیے۔" وہ دیوانہ وار چلانے لگا۔ "میں اس عشق میں کسی کو شریک نہیں کر سکتا جو مجھے تم سے ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم صرف میرے ساتھ نظر آؤ۔ مسکراؤ تو میرے لیے... سنگھار کرو تو میرے لیے... باتیں کرو تو صرف مجھ سے... زندہ رہو تو صرف میری خاطر...۔"

وہ دروازہ بند کر کے کوئی جواب دیے بغیر نکل گئی۔ حسبِ توقع کچھ دیر بعد جب وہ رونے کے بجائے برآمدے میں اکیلی بیٹھی خلا میں دیکھ رہی تھی وہ اس کے پاس آ بیٹھا۔ "پلیز... مجھے معاف کر دو... میں پاگل ہوں۔ دیوانہ ہوں... تمہارا دیوانہ۔ مجھے اپنے رشک اور حسد کے جذبات پر قابو نہیں... یہ دیکھو... میں نے اکبر اور اصغر کے نام بدلنے کی قانونی کارروائی مکمل کر لی ہے۔ اب وہ اکبر حمید اور اصغر حمید نہیں... اکبر نواز اور اصغر نواز ہیں...۔" نائلہ بدستور خلا میں گھورتی رہی۔ خلا اس کے ذہن میں بھی تھا۔

اگلے دن حق نواز خان اچانک غائب ہو گیا۔ آدھی رات کے بعد کسی وقت نائلہ نے دیکھا تو بیڈ پر اس کی جگہ خالی پڑی تھی۔ وہ صبح تک جاگتی رہی۔ صبح اس نے حق نواز خان کو اپنے پرانے کمرے میں چارپائی پر گھٹنے سمیٹے گہری نیند میں دیکھا۔ اس نے اپنی ماں کے تمام کپڑے نکال کے اوپر ڈھیر کر لیے تھے مگر اس کا مقصد سردی سے بچنا نہیں تھا۔ وہ اسی ماں کی گود میں سو رہا تھا جسے وہ قتل کر چکا تھا۔ نائلہ نے آہستہ سے دروازہ بند کیا اور لوٹ آئی۔ دیوار پر لگے ہوئے کیلنڈر پر گیارہ اکتوبر کی تاریخ کا رنگ اسے سرخ نظر آیا۔ حالانکہ وہ دوسرے ہندسوں کی طرح سیاہ تھا۔ نائلہ نے اپنے شوہر کو دوبارہ اس وقت دیکھا جب دوپہر کے کھانے کا وقت گزر چکا تھا۔ وہ بالکل نارمل تھا اور بہت پُرسکون نظر آتا تھا۔ "شاید ہمیشہ کی طرح ماں پھر اس سے نصف شب کے بعد ملنے آئی ہوگی۔" نائلہ نے تلخی سے سوچا۔ اس نے اپنے رویے کی کوئی وضاحت نہیں کی اور نائلہ سے باتیں کرتا رہا۔ اگلے دن مری میں برفباری دیکھنے کے لیے جانے کا پروگرام بناتا رہا۔ ہنستا رہا۔ اور ہنسانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ اس نے ماں کی برسی کے دن کا حوالہ بھی نہیں دیا۔ شام کو نائلہ نے دیکھا تو وہ اپنی شکاری بندوق لے کر گاڑی میں کہیں جا رہا تھا۔

"مسز نواز... پولیس انسپکٹر نے بڑی شائستگی سے کہا۔ "آپ کے سابق شوہر مسٹر عبدالحمید کو آپ کی طرف سے نو اکتوبر کو ایک تار ملا کہ آپ ان سے بچّوں کے مستقبل کے بارے میں فوراً کوئی بات کرنا چاہتی ہیں۔ انھوں نے نئی نئی ملازمت شروع کی تھی مگر ان کو کمپنی کی ایک گاڑی مل گئی اور وہ ایک گھنٹے کی رخصت لے کر روانہ ہو گئے پھر چار دن تک ان کا کوئی سراغ نہیں ملا...۔"

"دیکھیے... نائلہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں نے اس قسم کا کوئی تار نہیں دیا تھا۔"

"یاد کرو جان... تم نے مجھ سے ٹیلی فون پر ذکر تو کیا تھا کہ

حمید تم سے اس موضوع پر بات کرنا چاہتا ہے۔" حق نواز نے نرمی سے کہا۔ "اور یہ اس دورے سے پہلے کی بات ہے۔ ممکن ہے تم بھول گئی ہو۔" پھر وہ انسپکٹر کو اپنی بیوی کے اس حادثے کے بارے میں بتانے لگا جس کا ذکر نائلہ نے ڈاکٹر یوسف کے سامنے کیا تھا۔ نائلہ شدتِ جذبات میں دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹتی رہی۔

"بات کچھ عجیب سی ہے مسز نواز...۔" انسپکٹر نے کہا۔ "کیا شادی کے بعد آپ کبھی ان سے پھر ملی تھیں...؟"

"جی...۔" نائلہ نے محسوس کیا کہ اس کا پورا بدن لرز رہا ہے۔ طوفان کی زد میں آئے ہوئے کمزور درخت کی طرح۔

"لیکن آپ نے مسٹر حق نواز سے یہ بات چھپائی تھی۔" انسپکٹر نے کہا۔ "کیوں...؟"

"اس کا جواب میں دوں گا۔" حق نواز نے کہا۔ "ایک عورت جس کا گھر آباد ہو کسی بلیک میلر سے ملنے جائے گی تو شوہر کو بتا کے نہیں جائے گی۔ نائلہ مجھ سے ڈرتی تھی۔ حالانکہ میں اس کی مجبوری کو سمجھتا ہوں۔ اس پر اعتماد کرتا ہوں اور اس سے خفا ہو ہی نہیں سکتا۔ میں نے حمید کو اپنے گھر کے اندر آتے اور نائلہ کو ٹیکسی میں اس کے ساتھ جاتے دیکھ لیا تھا مگر مجھے معلوم تھا وہ حمید کو تیس ہزار روپے دینے گئی ہے۔ نائلہ ایک گھنٹہ پانچ منٹ بعد اسی ٹیکسی میں واپس آئی تھی۔"

نائلہ نے اطمینان اور سکون کا ایک گہرا سانس لیا۔ اور جذبۂ احسان مندی سے مغلوب ہو کے اپنے فراخدل شوہر کی طرف دیکھا جس کی محبت اس کے تمام جذبات پر غالب تھی۔ "مجھے اپنی بیوی سے کوئی گلا نہیں۔" حق نواز نے کچھ دیر بعد کہا۔

"تھینک یو سر۔" انسپکٹر نے کہا۔ "آپ نے ٹیکسی کا نمبر بتا کے ہمارے تمام مسائل حل کر دیے ہیں۔ میں نے خود ٹیکسی ڈرائیور سے ہر بات پوچھ لی ہے جو آپ کی بیگم اور ان کے سابق شوہر کے درمیان ہوئی تھی۔ مسز نواز...۔" وہ پھر نائلہ سے مخاطب ہو گیا۔ "آپ کا شوہر اچھا آدمی نہیں تھا۔ ظاہر ہے اس نے شرافت کا لبادہ اوڑھ کے آپ کو دھوکا دیا اور آپ سے شادی کر لی۔ بعد میں آپ پر انکشاف ہوا کہ وہ نشہ کرتا ہے۔ اس عادت کے باعث چار جگہ سے اس کی ملازمت ختم ہوئی اور بے روزگاری کے عرصے میں آپ اس کی کفالت کرتی رہیں۔ غالباً خود آپ کو صرف اس لیے ملازمت اختیار کرنا پڑتی تھی کہ گھر چلتا رہے مگر حمید سٹہ بھی کھیلتا تھا۔ اسے جوئے کی لت بھی تھی اور میری معلومات کے مطابق اس کے مراسم ایک آفس کی ٹیلی فون آپریٹر سے بھی تھے جسے غیر رجسٹرڈ... قسم کی طوائف کہا جا سکتا ہے۔ کال گرل... انھی اسباب کی بنا پر بالآخر آپ کو طلاق لینا پڑی مگر وہ آپ سے بعد میں بھی رقم اینٹھتا رہا۔ وہ دھمکی دیتا تھا کہ قانوناً بچوں کو آپ سے چھین لے گا۔"

"ان سب باتوں کو میرے سامنے دہرانے کا مقصد کیا ہے؟" نائلہ کا حوصلہ جواب دے گیا۔

"ٹیکسی ڈرائیور کے بیان کے مطابق آپ کو حمید سے یہ خطرہ لاحق تھا کہ وہ آپ کی ازدواجی زندگی میں زہر گھول دے گا۔ وہ آپ کو پھر بلیک میل کر رہا تھا اور آپ نے اسے کہا تھا کہ حق نواز نے تمھیں قتل نہ کیا تو میں خود کروں گی۔" انسپکٹر نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اور جب آپ نے اس کو بے عزت کر کے ٹیکسی سے اتارا تھا تو حمید نے کہا تھا۔" اس نے ایک فائل کے چند صفحات پلٹ کر پڑھتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھ لوں گا تم سے بھی اور تمھارے اس تیس مار خاں سے بھی۔" اس نے فائل بند کر دی۔

"مسز حمید۔ آج ہمیں سوان ندی سے ایک سوزوکی وین ملی ہے۔ آپ جانتی ہوں گی ایوب پارک سے آگے پہاڑی کا موڑ کاٹتے ہی سوان ندی کا پل ہے۔ ندی میں آج کل پانی برائے نام ہوتا ہے۔ لوگ جوتے اتار کے پیدل بھی پانی میں سے گزر جاتے ہیں اور نہاتے بھی رہتے ہیں۔ پل کے دونوں جانب کچا راستہ ندی تک پہنچتا ہے اور پل پر سے دیکھا جائے تو وہاں اکثر ٹرک ڈرائیور اور دوسری گاڑیوں والے ڈرائیور کلینر قسم کے لوگ گاڑیاں دھوتے نظر آتے ہیں۔ وہ گاڑی کو بہتے پانی کے بیچ میں روک کر یہ کام کرتے ہیں۔ بعض اوقات تانگے والے بھی تانگے دھوتے ہیں۔ آج صبح ہمیں کسی نے فون کیا کہ چار دن سے ایک سوزوکی پانی میں کھڑی ہے اور اس میں کوئی شخص بیٹھا ہوا ہے۔ غالباً وہ زندہ نہیں ہے۔ اطلاع دینے والے نے سوزوکی کا نمبر تک بتا دیا مگر اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ لوگ ایسے چکروں میں پڑتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ہم عموماً گمنام کال پر ایکشن نہیں لیتے مگر اطلاع دینے والا سچ بول رہا تھا اور کچھ خائف بھی تھا۔ یقیناً وہ قریب جا کے سوزوکی کے اندر جھانک چکا تھا۔ اور اس نے مسٹر حمید کی لاش دیکھ لی تھی۔"

نائلہ کو ایک ابکائی آئی۔ اس کے سینے میں سے کوئی چیز نکل کر اس کے حلق میں پھنس گئی۔ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ کمرہ آؤٹ آف فوکس ہونے لگا۔ ڈولنے لگا۔ حق نواز کی صورت۔ انسپکٹر کی آواز۔ اپنے وجود کا احساس سب ختم ہونے گئے یہاں تک کہ ایک گہرا تاریک خلا رہ گیا۔ سرد۔ سفاک اندھیرا جو کسی قبر کی گہرائی سے زیادہ بے حس تھا۔

اسے ہوش آیا تو سب کچھ وہی تھا لیکن وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر یوسف اس کے پاس دائیں جانب کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ نائلہ نے اپنے شوہر حق نواز کو اس کے ساتھ دوسری کرسی پر اتنا ہی متفکر بیٹھے دیکھا۔

"پرانے ذہنی صدمے کے اثرات پوری طرح زائل نہیں ہوئے تھے۔ یہ حادثہ ذہن کو متاثر کر سکتا ہے۔" ڈاکٹر یوسف نے کہا۔

"تمھارا مطلب ہے۔ وہ سب کچھ پھر ہو سکتا ہے کہ کوئی بات یاد نہ رہے۔ نائلہ سوتے میں چلنے لگے؟" حق نواز نے کہا۔

یوسف نے اقرار میں سر ہلایا۔ "یا ایسا ہی ہے جیسے کوئی مندمل ہونے سے پہلے زخم کو کھرچ دے اور ..."

نائلہ اٹھ بیٹھی۔ "یوسف بھائی۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ معلوم نہیں کیوں مجھے چکر سا آ گیا تھا۔" پھر اس نے دوسری طرف دیکھا۔ "وہ انسپکٹر اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔" آپ کیسے انسپکٹر صاحب۔ کیا حمید کو کسی نے قتل کر دیا ہے؟"

انسپکٹر نے اجازت طلب نظروں سے ڈاکٹر یوسف کی طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے بھابی کہ آپ پہلے ایک کپ چائے کا پی لیں۔ گلوکوز ڈال کے۔" یوسف نے کہا۔ "کافی ہو تو بہتر۔"

"ابھی دس منٹ میں کافی آ جاتی ہے۔" حق نواز نے چٹکی بجا کے کہا۔ "تم ابھی لیٹی رہو۔" اس نے نائلہ کو حکم دیا۔

"میں یہ افسوسناک اطلاع دینے پر مجبور ہوں مسز نواز۔" انسپکٹر نے کافی پی کر برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "مسٹر حمید اب زندہ نہیں ہیں اور پوسٹ مارٹم تو ابھی نہیں ہوا لیکن اندازہ یہی ہے کہ ان کی موت چار دن قبل ہوئی تھی۔ گاڑی میں سے ایک سرخ شال ملی ہے۔ پھٹی ہوئی۔ اس پر زرد پھول ہیں۔ مسٹر حق نواز نے شناخت کے بعد تسلیم کیا ہے کہ شال آپ کی ہے۔ حمید کی جیب میں سے وہی تار ملا ہے جو راولپنڈی سے دیا گیا تھا۔ سوزوکی وین کی رجسٹریشن پلیٹ لاہور کی ہے اور وین اسی کمپنی کی ہے جہاں حمید اب کام کرنے لگا تھا۔ گاڑی کے اندر سے چند بال بھی ملے ہیں۔ بالکل اسی رنگ کے جیسے آپ کے بال ہیں۔ سنہرے۔ لمبے۔ حمید کے کوٹ کی اندر والی جیب سے آپ کی ایک بالکل نئی تصویر بھی نکلی تھی۔"

"آپ ... آپ ثابت کر رہے ہیں کہ ... کہ میں نے اس کو قتل کر دیا؟" وہ ہکلائی۔

"جی نہیں ... اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔" انسپکٹر نے کہا۔ "صرف ایک مفروضہ ہے۔ کہ آپ نے تار دے کر اسے بلایا۔ شاید اسے آخری بار خبردار کرنے کے لیے ... آپ کے شوہر لاہور گئے ہوئے تھے۔ مگر ملازمین کی موجودگی میں بھی آپ اس کو گھر میں بلانے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھیں۔ آپ نے اسے باہر ملنے کو کہا ... اور اس خوف سے کہ کوئی جاننے والا نہ دیکھ لے آپ نے اس سے تنہائی میں بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ایوب پارک میں ایک جگہ ہو سکتی تھی۔ لیکن وہ آپ کے ساتھ ایسی جگہ چلا گیا جہاں کوئی چوکیدار تک نہیں ہوتا۔ وہاں شاید جذبات سے مغلوب ہو کے۔ یا نشے میں اس نے دست درازی کرنا چاہی لیکن آپ نے مزاحمت کی جس کے نتیجے میں آپ کی وہ شال پھٹ گئی۔ جو پرانی ہو چکی تھی ... اور آپ وہاں سے بھاگ آئیں۔ سوزوکی وہاں نہیں کھڑی تھی جہاں لوگ گاڑیاں دھوتے ہیں بلکہ ذرا آگے تھی۔ قیاس کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ حمید بعد میں پیچھے کی سیٹ پر جا کے سو گیا۔ وہ لاہور سے ڈرائیو کر کے آیا تھا اور چار گھنٹے میں پنڈی پہنچا تھا۔ کم سے کم پچاس میل کی رفتار سے کیونکہ درمیانی فاصلہ ایک سو اسی میل ہے ... اور اسے رات تک واپس بھی پہنچنا تھا اور وہ تھکا ہوا تھا۔ وہ ہینڈ بریک لگانا بھول گیا تھا چنانچہ گاڑی لڑھک کر آگے گئی نشیب کی جانب اور جہاں سے اب گاڑی ملی ہے وہاں دریا کی سطح میں ایک گڑھا ہے۔ تقریباً دس گز لمبا اور چوڑا۔ اور درمیان میں سات آٹھ فٹ گہرا۔ گزشتہ شب کی بارش کی وجہ سے پانی کچھ زیادہ تھا چنانچہ سوزوکی ڈوب گئی اور حمید جو اس کی پچھلی سیٹ پر تھا فوراً نہ نکل سکا۔ ڈوبنے والے کے اوسان بہت جلد خطا ہو جاتے ہیں۔ وہ بدحواس نہ ہوتا تو ایک منٹ میں دروازہ کھول کے باہر آ جاتا۔ دو منٹ تک پانی کے نیچے سانس روکے رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ دو یا تین منٹ بعد پانی اس کی ناک اور منہ کے راستے پھیپھڑوں میں داخل ہو گیا ہو گا۔"

"وہ بدبخت خود ہی مر گیا۔" حق نواز نے کہا۔ "اگر خود نائلہ نے اسے قتل کر دیا ہوتا تب بھی مجھے تعجب نہ ہوتا۔ نائلہ کو اس سے سخت نفرت تھی۔ اپنے بچوں کے ساتھ بہت مطمئن اور خوش ہے۔ ہم ایک خاندان کے لوگ ہیں جن کو ایک دوسرے کی محبت پر اعتماد ہے۔ ہمارے خیال میں یہ حادثہ ہی تھا نا انسپکٹر۔" اس نے جیب سے ایک خاکی رنگ کا لفافہ برآمد کیا اور آگے کھسکا دیا۔

"حادثہ۔ سو فیصد حادثاتی موت تھی۔" انسپکٹر نے لفافے کو اپنی جیب میں منتقل کر لیا۔ کسی سے نظر ملائے بغیر۔ "ہم نے تو خبر میں بھی بیگم صاحبہ کے تعلق کا حوالہ نہیں دیا ہے —— آپ بالکل مطمئن رہیں حق نواز صاحب۔ آپ عزت دار آدمی ہیں۔ خود ایس پی صاحب آپ کے مداح ہیں۔ آپ کے پاس تو مجھے محض رسمی کارروائی کی خاطر حاضر ہونا پڑا۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔ خدا حافظ۔"

سکون بخش اور خواب آور گولیاں کھا کے سونے کے باوجود اس رات نیلو نے ذہن میں جاگزیں ہو جانے والے ہر منظر کو خواب کی صورت میں دیکھا۔ جو ایک ہی رات کے مختلف حصوں میں اس کو ڈراتے رہے۔ جگاتے رہے۔ سزا دیتے رہے صبح ہوتے ہوتے اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کے اوپر جھکا ہوا ہے۔ لمبے لمبے بالوں کا لمس اسے اپنے رخساروں پر محسوس

ہوا۔ صندل کے عطر کی تیز خوشبو اس کے حواس پر حملہ آور ہوئی
"نائلہ... میں رضیہ ہوں... میں جانتی ہوں... مگر... میں
حق نواز کو بتاؤں گی نہیں کہ تم نے حمید کے سر پر پتھر مارا تھا...
وہ تمہارے تعاقب میں دوڑا تھا نا... اور ندی کے کنارے صرف
پتھر تھے۔ وہ چکرا کے گرا تھا اور پھر وہاں سے گاڑی میں جا کر
لیٹ گیا تھا۔"

وہ ایک چیخ مار کے اٹھ بیٹھی۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے سینے کے زنداں کی دیواریں توڑ دے گا اور وہ پسینے میں تر تھی۔ دسمبر کی یخ بستہ صبح میں شیشوں کے باہر نمی تک جم گئی تھی اور سبزے پر سفید چادر سی نظر آتی تھی مگر اس کا وجود دہک رہا تھا۔ حق نواز باتھ روم سے برآمد ہوا۔ ایک تولیہ لپیٹے اور دوسرے سے سر کو رگڑتا ہوا "اب کیا ہو گیا؟" وہ اس کے پاس آ کے بولا "رات بھر چیخ پکار مچائے رکھی تم نے..."

"نواز..." وہ اس کے سرد لہجے سے سہم کر بولی "کیا۔ کیا چلاتی رہی ہوں میں رات بھر؟"

وہ ہنسا اور آئینے کے سامنے کھڑا ہو کے کپڑے بدلنے لگا "وہی جو تمہارے لاشعور میں ہے۔ جو تم نے کیا تھا اور بھول گئی ہو۔"

"کیا بھول گئی ہوں میں؟ اور کیا۔ کیا تھا میں نے؟ اس کا مطلب ہے تم نے اس انسپکٹر..."

"ہاں" وہ پلٹ کر بولا "اس کا منہ میں نے بند کر دیا ہے۔ مگر کیا اس سے حقیقت بدل سکتی ہے۔ کیا تم نے وہ "تار نہیں دیا تھا؟ تم اس بدمعاش کے ساتھ سیر سپاٹا کرنے نہیں گئی تھیں۔ اس لیے کہ میرے جاتے ہی تمہیں کھلی چھٹی مل گئی تھی۔"

"تم بکواس کرتے ہو" وہ چیخ کر بولی "جھوٹ بولتے ہو۔"

"اور وہ جنھوں نے تم کو بڑے اہتمام سے تیار ہو کے جاتے دیکھا تھا۔ جنھوں نے تمہیں اور حمید کو سلور گرل میں ایک ساتھ دیکھا تھا... وہ شرفا کا ریسٹورنٹ ہے لیکن تم نے جو کچھ وہاں کیا۔ تمہارا رویہ کسی طوائف سے کم غلط نہیں تھا" وہ حقارت سے بولا "چنانچہ ویٹر نے اپنی آنکھوں سے سب دیکھا تھا مگر منہ پھیر لیا تھا۔ وہ تمہیں بے عزت کر کے بھی نکال سکتے تھے۔ لیکن مینجر نے حالات کو خود سنبھال لیا۔ ملو گی اس سے؟ تفصیلات وہ بھی بتا سکتا ہے۔ وہاں سے نکل کے تم دونوں سیروز سینما گئے تھے۔ میں بتا دوں تم نے کون سی فلم دیکھی تھی۔ سمر آف فورٹی ٹو۔ تم دونوں سب سے پیچھے والی قطار میں تھے۔ فلم کے مناظر نے اگر تمہارے جذبات میں آگ لگا دی تھی تو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ تم ہو تو میں جانتے ہوئے ڈرتی تھیں۔ سوان ندی کے کنارے پر بھی۔"

"نواز" وہ اس پر دیوانہ وار حملہ آور ہوئی "تو سمجھتا ہے مجھے کچھ معلوم نہیں... کہ تو بندوق لے کر کہاں گیا تھا؟" نواز کا بھرپور ہاتھ اس کے منہ پر پڑا "بے غیرت۔ فاحشہ۔ مجھے بھی سب معلوم ہے... دلشاد نے مجھے رات نو بجے گھر آتے دیکھا تھا۔ میری حالت دیکھی تھی۔ اسے کسی نے گولی نہیں ماری تھی۔ تو نے اسے پہاڑ کا دھوکا دے کر ڈبو دیا۔ وہ میرے لیے خطرہ بن رہا تھا۔" وہ تیورا کے گر پڑی۔ شاید خود اسی نے کہا تھا کہ وہ بندوق کی زد پر حمید کو وہاں لے گیا تھا... مگر دلشاد... سلور گرل کا ویٹر اور مینجر... سیروز... میرے خدا۔ کیا میں پھر اس پرانے ذہنی عارضے کا شکار ہو رہی ہوں۔ میں نے سب کچھ کیا تھا لیکن مجھے یاد نہیں۔ اتنے بہت سے لوگ جھوٹ تو نہیں بول سکتے۔ اور میری شال... میرے بال۔ انسپکٹر نے لفافے میں کتنی رقم وصول کی تھی... کیا واقعی میں نے اسے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بلایا... اور جب اسے یقین آنے لگا کہ میں اس کے بس میں ہوں۔ میں نے اسے بے بس پا کے اس کے سر پر پتھر دے مارا... یہ کس نے بتایا تھا مجھے کہ میں نے اس کے سر پر پتھر مارا تھا... اف میرے خدا۔ مجھے کچھ یاد نہیں... کچھ معلوم نہیں۔ یہ سب کیا ہوا۔ کیسے ہوا۔ کیوں ہوا...

نیم بے ہوشی کے عالم میں وہ بیڈ تک پہنچی اور لیٹ کر چھت کو گھورنے لگی۔ اچانک اسے ایک اور بات یاد آئی۔ جس روز حق نواز لاہور گیا تھا اور صبح اسے تکیے پر اس کا پیغام پن کیا ہوا ملا تھا۔ ناشتہ کرتے ہوئے اکبر اور اصغر نے اس سے پوچھا تھا "ممی... آپ رات کو ہمارے کمرے میں کیوں آئی تھیں" اور اس نے حیرانی سے دونوں کو دیکھا تھا۔

"میں... میں آئی تھی۔!" وہ ہنس کے بولی تھی "بھئی میں تو اٹھی تک نہیں بیڈ سے۔ تم نے خواب دیکھا ہو گا۔"

مگر کیا یہ ممکن ہے کہ دونوں بچوں نے ایک ہی خواب دیکھا ہو۔ وہ یقیناً سوتے میں چلتی ہوئی ان کے کمرے میں جا پہنچی تھی۔ اس کے تمام پرانے ذہنی عارضے پھر اس کو دیوانگی کے حصار میں لے جا رہے تھے... رحم میرے خدا... اس نے آنکھیں بند کر کے دعا مانگی۔ یہ زندگی مجھے بہت عزیز ہے اپنی عنایات کے بعد مجھے میری خوشی سے محروم نہ کر۔ اس کے ذہن میں اندیشے مکڑی کے جالوں کی طرح پھیل رہے تھے۔

دوپہر سے پہلے اس نے کرم داد کو طلب کیا "کرم داد۔ تم یہاں میرے واحد دوست ہو۔ جو میری بات سمجھ سکتے ہو۔ ... مجھے بتاؤ کیا میں پاگل ہو رہی ہوں... بہت سی باتیں مجھ سے منسوب کی جا رہی ہیں۔ میرا خیال ہے میں نے

کچھ نہیں کیا۔ کیا یہ سچ ہے کہ تمہاری ماں نے مجھے گھر سے باہر جاتے اور رات کو نو بجے آتے دیکھا تھا۔"

"وہ یہی کہتی ہے بیگم صاحبہ۔ اور اسے یقین ہے کہ وہ غلط نہیں کہتی۔ اس نے راجہ صاحب کو بتا دیا تھا۔ حالانکہ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ خاموش رہے کسی سے کچھ نہ کہے" کرم داد نے کہا۔ "لیکن اس کا گواہ مدد شاہ میرا باپ ہے۔"

"تمہاری ماں تو رضیہ کی روح کو بھی دیکھ سکتی ہے۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔ "لیکن تمہارے باپ نے بھی دیکھا تھا؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں حمید کے ساتھ سلور گرل بھی گئی تھی۔ سیروز سینما بھی۔ میں نے اسے تار بھی دیا تھا؟ کیوں کرم داد؟" "لیکن آپ کو سیروز سینما سے نکلتے تو میں نے بھی دیکھا تھا۔ آپ کے ساتھ ایک اور مرد تھا۔۔۔ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا آپ کے ساتھ ہی وہ بھی ٹیکسی میں بیٹھ گیا تھا۔ میں خود بھی فلم دیکھ کر نکلا تھا۔۔۔"

شک کی اب کوئی گنجائش نہ رہی تھی۔ یقیناً سلور گرل میں بھی اس نے غیر شریفانہ طرز عمل اختیار کیا ہوگا۔ "میں آپ کا ہمدرد ہوں۔ آپ کی حفاظت کرنا چاہتا ہوں بیگم صاحبہ۔ آپ نے مجھے دوست سمجھا۔ میری خوش قسمتی۔ میں راجہ صاحب کو کبھی کچھ نہیں بتاؤں گا۔۔۔" وہ عالم بے خودی میں بولتا گیا۔ اس کی نظر نائلہ پر جمی رہی جس کا چہرہ تکیے پر بکھرے ہوئے بالوں کے سنہرے ڈھیر میں یوں دمک رہا تھا جیسے شفق کے اجالے میں آفتاب۔ "تقریباً ایک ہفتہ پہلے حمید رات کے وقت آیا تھا۔ اس نے میری ماں سے کہا کہ وہ آپ سے ملنے آیا ہے اور آپ کو خاموشی سے اطلاع کر دی جائے۔۔۔ میری ماں نے پوچھا تھا کہ تم کون ہو؟ تو اس نے کہا میں نائلہ کا پہلا شوہر ہوں۔ میری ماں نے اسے برا بھلا کہا اور کہا کہ وہ فوراً واپس چلا جائے۔ رضیہ کا گھر برباد نہ کرے۔ وہ تمہیں رضیہ ہی کہتی ہے نا۔ حمید حیران ہوا۔ رضیہ؟ رضیہ کون۔ مجھے نائلہ نے بلایا تھا اور کہا تھا خاموشی سے پیچھے کی طرف سے آ جاؤں۔ آوازیں سن کر میں آ گیا۔ میں ابھی سویا نہیں تھا۔ میں نے اسے کہا کہ خیریت چاہتے ہو تو دفع ہو جاؤ۔ وہ چلا گیا تو میں نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ اس واقعے کا ذکر کسی سے نہ کرے۔۔۔ مگر وہ بوڑھی عورت ہے۔۔۔ اور کچھ مخبوط الحواس۔ اس نے راجہ صاحب کے سامنے بک دیا کہ رات کو حمید آیا تھا۔ رضیہ سے ملنے۔۔۔ میں نے اسے اشارا کیا۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔۔۔"

"کرم داد۔۔۔ یہ سب سچ ہے۔۔۔ تو تم نے ریشماں کو خاموش رہنے کے لیے کیوں کہا تھا؟" وہ بولی۔

"اس لیے۔۔۔ اس لیے بیگم صاحبہ۔۔۔ کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔۔۔ اس محبت کے بدلے میں کچھ نہیں چاہتا آپ سے میں کبھی کچھ نہیں مانگوں گا۔۔۔ مجھے معلوم ہے راجہ صاحب کتنے حاسد ہیں۔۔۔ وہ مجھ پر بھی شک کرتے ہیں۔ مجھے بھی اپنا رقیب سمجھتے ہیں حالانکہ میں کیا اور میری اوقات کیا۔ وہ مجھے قتل بھی کر سکتے ہیں۔۔۔ لیکن آپ فکر نہ کریں۔ یہ جان جب تک ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔۔۔ میں آپ پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔۔۔ آپ کی خاطر یہ جان رہے یا جائے۔ مجھے پروا نہیں۔" کرم داد بولتا گیا لیکن نائلہ نے اس کی باقی بات سنی ہی نہیں تھی۔ اس کا ذہن ان حقائق کی طرف چلا گیا تھا جن کو اس کے ذہن نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ حمید کو قتل کر چکی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کو بھی دھوکا دیا۔

دو ہفتے تک اس کی ذہنی کیفیت ویسی رہی جیسی بس کے حادثے کے بعد چھ ماہ تک رہی تھی۔ اسے دن وقت کچھ یاد نہیں رہتا تھا۔ وہ بھول جاتی تھی کہ کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ ایک بار اسے بہت دیر تک سوچنا پڑا کہ حق نواز سے شادی کے وقت وہ لاہور کے کس پبلشر کی دکان میں ملازم تھی۔ لاہور میں اس کے گھر کا نمبر کیا تھا۔ گلی کا نمبر کیا تھا۔ پھر ایک دن اس نے طے کیا تھا کہ وہ حق نواز کو ایک خوش خبری سنائے گی جو اپنا بیشتر وقت اسٹڈی میں گزارنے لگا تھا لیکن بعد میں اسے یہ بتانا یاد ہی نہ رہا کہ وہ ایک بچے کی ماں بننے والی ہے۔ جب بالآخر ایک دن کھانا کھاتے ہوئے اس نے حق نواز پر یہ انکشاف کیا تو حق نواز نے اس کی طرف دیکھے بغیر سر ہلایا اور جذبات سے یکسر عاری لہجے میں کہا۔

"بڑی اچھی بات ہے۔" وہ بجھ کے رہ گئی۔ پھر ایک حیرت انگیز بات ہوئی۔ حق نواز نے اچانک کھانا چھوڑ کے اس کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ "تم۔۔۔ تم ماں بننے والی ہو۔۔۔ میرے بچے کی۔" اس نے اٹھ کر نائلہ کے قریب آتے ہوئے مسرت سے چلا کے کہا۔ "اب دیکھو۔ مجھے لڑکا چاہیے۔ بالکل اپنے جیسا۔ یہ میرا حکم ہے۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ "تم جیسی چینی کی گڑیا ابھی نہیں۔" وہ شرم سے گلنار ہو کے بے ساختہ ہنسی۔ ہنسی ایک گوہر نایاب تھی جو کھو گئی تھی۔ روشنی کی کرن تھی جو اس سے بچھڑ گئی تھی۔ خوشبو تھی جو جدا ہو گئی تھی اور قوس قزح تھی جو اندھیرے میں تحلیل ہو گئی تھی۔

"شرم تو نہیں آتی۔ بڑے آئے حکم دینے والے۔ یہ تو خدا کی مرضی ہے۔" اس نے اپنا چہرہ چھپا کے کہا تھا۔

لیکن خوشی کی یہ ساعت نایاب بھی سراب ثابت ہوئی۔ نائلہ نے باہر سے کسی کو زور زور سے چلاتے سنا۔ نائلہ نے کرم داد کی آواز پہچان لی۔ اس کی آواز کے ساتھ

گھوڑا ہنہنا رہا تھا۔

"یہ ... یہ نور بخش ہے۔" حق نواز نے تشویش سے کہا اور کھڑکی کھول کے باہر دیکھا۔ نور بخش اصطبل سے باہر نکل کے کرم داد پر حملہ کر رہا تھا۔ اس کے اگلے سموں نے کرم داد کو زخمی کر دیا تھا۔ وہ نیچے پڑا خود کو گھوڑے کی وحشیانہ یلغار سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا اور ہاتھوں سے اپنا چہرہ بچا رہا تھا۔ خون اس کے چہرے پر بہہ رہا تھا اور اس کے ہاتھوں پر پھیل گیا تھا۔ مدد شاہ سرونٹ کوارٹر سے دوڑتا ہوا نکلا۔ ریشماں نے دیوانہ وار چیخنا شروع کیا۔ لیکن کرم داد نے نور بخش کو لگام سے پکڑ کے قابو میں کرنے کی جدوجہد ترک نہیں کی۔ حق نواز یک لخت اندر کی طرف بھاگا۔ ایک منٹ بعد وہ شکاری رائفل لیے نمودار ہوا۔ "مدد شاہ" اس نے چیخ کر کہا۔ "ہٹ جاؤ سب۔ کرم داد خبیث چھوڑ دے اسے۔ نور بخش پاگل ہو گیا ہے۔ میں اسے شوٹ کر رہا ہوں۔ ہٹ جاؤ ورنہ گولی لگ جائے گی کسی کو۔"

"تو..." ریشماں نے کھڑکی میں حق نواز سے لگی تھر تھر کانپتی نائلہ کی طرف انگلی اٹھا کے چیخ ماری۔ "تو بدروح ہے ... منحوس ... یہ سب تیرا..." اس کی آواز فائر کی گونج میں دب گئی۔ حق نواز کی گولی گھوڑے کے سر میں لگی تھی۔ وہ اچھلا اور آخری بار ہنہنا کر زمین پر گرا۔ چند سیکنڈ تڑپا اور ساکت ہو گیا۔ چند سیکنڈ تک وقت۔ ہر نظر۔ ہر دل کی دھڑکن۔ زمین کی گردش۔ آوازوں کا شور۔ سب تھم گئے۔ پھر حق نواز نے پلٹ کر دیکھا۔ نائلہ اس کے قدموں میں ڈھیر ہوئی پڑی تھی۔ اس نے نائلہ کو گود میں اٹھا کے بستر پر لٹایا اور نیچے اتر گیا۔

"بدمعاش۔ سور۔ ہزار بار کہا ہے تجھ سے..." مدد شاہ جوان بیٹے کو اپنے ناتواں ہاتھوں سے مارتے ہوئے چلا رہا تھا۔ اس کے خون سے اپنے ہاتھ بھی رنگ رہا تھا۔ "وہ چوہے مار گولیاں اصطبل میں نہ رکھا کر۔ اس کے دانے میں مل گئیں تو گھوڑا پاگل ہو جائے گا مگر تو کسی دن ہمیں بھی پاگل کر دے گا کتے..."

"چوہے مار گولیاں گھوڑے کے دانے میں کیسے مل گئیں" حق نواز نے رائفل ہاتھ میں لے کر سرد لہجے میں کہا۔

"قسم خدا کی راجہ صاحب صرف ایک بار میں وہ گولیاں لایا تھا" لہولہان کرم داد نے کہا۔ "اور میں نے ابا کے کہنے پر وہ ڈبہ گیراج میں رکھ دیا تھا۔ یہاں بہت بڑے بڑے چوہے ہیں۔ زمین میں سوراخ کر کے ہر جگہ نکل آتے ہیں... گھوڑے کو کاٹ لیتے... میرا قصور معاف کر دیں راجہ صاحب... مجھے معلوم ہے نور بخش آپ کو کتنا عزیز تھا۔"

"میرے بیٹے کی جان بخش دے نواز" ریشماں چلائی۔

"نہیں تو میں تیری اس چڑیل بیوی کا خون پی جاؤں گی اور اس کے ہونے والے بچے کا بھی" نائلہ کی دل خراش چیخ کھلی کھڑکی سے سنائی دی۔ وہ حق نواز کے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔ حق نواز نے رائفل نیچے کی اور پلٹ کر حویلی کی طرف چلنے لگا۔

●

ہسپتال کی بے حس دیواروں میں وہ تخلیق کے کرب سے گزر رہی تھی۔ اس کی جذباتی کیفیت بہت عجیب تھی۔ مسرت میں خیالات کا انتشار شامل تھا۔ ہر طرف پرانی آوازوں کی بازگشت تھی۔ "تو ہاتھ جوڑ کے کس کی زندگی کے لیے بھیک مانگ رہی تھی؟ کیا لگتا ہے وہ تیرا؟ تو نے پہلی بار اسے برطرف ہونے سے بچا لیا تھا۔ پہلی نظر میں ہی دل آ گیا تھا۔ اس پر؟ مجھ سے زیادہ جوان ہے۔ ہینڈسم ہے مگر تیری خاطر میں نے اسے نہیں بخشا تھا۔ وہ میری ماں کو ماں بن کے پالنے والی عورت کی مامتا تھی جس کا خون میں نے نہیں کیا۔ قسم خدا کی حق نواز۔ حمید سے میں نے فون پر تیس ہزار دینے کی بات کی تھی۔ میں اسے تیس ہزار دینے کے لیے ٹیکسی میں اس کے ساتھ بیٹھی بھی تھی مگر اسی میں واپس آ گئی تھی۔ فاحشہ۔ بدکردار۔ یہ میری ماں کا بستر ہے۔ تو نے اس کی آبرو بھی نہیں رکھی۔ تو نے اپنے پہلے شوہر کو قتل کر دیا تھا۔ تو مجھے بھی زہر دے دے گی۔ قاتل... قاتل... قاتل..." ہر طرف شور کی گونج تھی۔ ہر انگلی اس کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ زبانِ خلق نقارۂ خدا ہے تو کوئی اس بیٹے کی طرف انگلی کیوں نہیں اٹھاتا جس نے سالگرہ کے تحفے میں ملنے والی ہاکی سے ماں کو قتل کیا تھا؟ اس لیے کہ وہ ماں سے محبت کی دیوانگی کا فریب دے سکتا ہے۔ دنیا کو بھی اور اپنے آپ کو بھی۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ کرم داد نے کہا تھا۔

بالآخر درد تھم گیا۔ تھم گیا شورِ جنون ختم ہوئی بارشِ سنگ۔ فرشتۂ رحمت نے اس کے کان میں جھک کر سرگوشی کی۔ مبارک کہ تم نے ماں کا منصب حاصل کیا۔ اس کے وجود سے مامتا کے سوتے ابلنے لگے۔

"بیٹیا مبارک ہو مسٹر حق نواز" دوسرے فرشتے نے کہا۔ "آئی ایم سوری کہ آپ ابھی اسے نہیں دیکھ سکتے۔ ہم نے اسے چوبیس گھنٹے کے لیے آکسیجن ٹینٹ میں رکھا ہے۔"

"تمہیں یقین ہے سسٹر کہ لڑکا بالکل اپنی ماں پر گیا ہے۔؟"

"یس سر۔ اس میں شبہے کی کوئی بات ہی نہیں۔ بہت خوب صورت بچہ ہے۔ خدا زندگی دے۔ یو آر لکی مسٹر حق نواز۔"

"مجھے اپنے جیسا بیٹا چاہیے۔ یہ میرا حکم ہے۔ حق نواز

کی آواز نے ماضی سے لوٹ کر جواب دیا۔ راجہ صاحب اپنے والد کا نقشِ ثانی تھے۔ کرم داد نے اسے یاد دلایا۔ اوہ' میرے خدا۔ !!)

ایک ہفتے بعد اس نے اپنے بیٹے کو اور پھر اس کے برتھ سرٹیفکیٹ کو دیکھا۔ "نواز" اس نے فریاد کی۔ "یہ کیا ہے۔ اس پر اظہر حمید کیوں لکھا ہے؟ اظہر نواز کیوں نہیں ہے؟"

"کیا فرق پڑتا ہے اس سے" حق نواز نے ہنس کر کہا۔ "تم تو پڑھی لکھی عورت ہو۔ شیکسپیئر نے کیا کہا تھا کہ نام میں کیا رکھا ہے۔ گلاب کا نام ببول اور ببول کا گلاب رکھنے سے کیا ہوتا ہے؟"

"مگر تم تو اکبر اور اصغر کے نام بھی بدل چکے ہو۔ پھر اس کا مطلب...؟"

"بھئی آدمی سے ہی غلطی ہوتی ہے نا" طنز کی کاٹ تلخی کے زہر میں بجھا ہوا لہجہ "ایک غلطی مجھ سے ہوئی تھی پھر ایک تم سے ہو گئی۔ بات برابر" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

"کیسی غلطی؟ کس کو غلطی کہہ رہے ہو تم؟" وہ بپھر گئی "مجھ سے شادی تمہاری غلطی تھی یا میری مگر تم کس غلطی کا حوالہ دے رہے ہو؟ تہمت لگا رہے ہو مجھ پر...؟"

"یہ تو چور کی داڑھی میں تنکے والی بات ہو گئی" وہ مسکرایا "کیا غلط نام رکھنا غلطی نہیں ہو سکتا؟"

"نہیں۔ تم نے جانتے بوجھتے یہ نام لکھوایا ہے۔ میں اس کو بدل دوں گی حق نواز"

"بدل دینا۔ اظہر نواز۔ اظہر کرم داد۔ اظہر نیرا غیرا نتھو خیرا جو چاہو کر دینا۔ مجھے کیا فرق پڑتا ہے اور اس سے حقیقت تو نہیں بدلی جا سکتی" وہ بے رحمی سے بولا "کرم داد اسپتال میں ہے اور بے ہوشی میں بہت کچھ سچ بول چکا ہے۔"

"یہ انتہا ہے حق نواز۔ میرا خیال ہے اب میں اور تم ایک دوسرے کے اعتماد سے محروم ہو چکے ہیں۔ ہمیں زبردستی ازدواجی زندگی کا جوا اٹھا کے ساتھ چلنے کی ضرورت نہیں" اس نے قطعی لہجے میں کہا اور بالکل پرسکون رہی "ہم میاں بیوی بن کے نہیں رہ سکتے تو دنیا کو دھوکا دینے سے کیا فائدہ۔ میں کسی بھی کرم داد یا حمید یا ایرے غیرے نتھو خیرے کے ساتھ رہ لوں گی تم ایک داشتہ رکھ لینا۔ وہ تمہارا یہ سلوک برداشت کر لے گی جو کوئی بیوی برداشت نہیں کر سکتی"

"ہمارے وضعدار گھرانوں میں ایک روایت اب بھی قائم ہے نائلہ۔ کہ بیٹی ایک بار ڈولی میں ماں باپ کے گھر سے جاتی ہے۔ دوسری بار چار افراد کے کندھوں پر شوہر کے گھر سے" وہ اٹھتے ہوئے بولا "اور میں اس معاملے میں انتہائی قدامت پسند ہوں۔ یہ تو تم جانتی ہی ہو۔ یا مجھے سمجھانا پڑے گا؟"

"بیگم صاحبہ" آیا نے بدحواسی کے عالم میں اندر آ کے کہا "ہسپتال... ڈاکٹر کو بلوائیے۔ اظہر"

"بلوا لو ڈاکٹر کو بھی" نواز نے سفاکی سے کہا "مگر وہ اپنی رائے پہلے ہی دے چکے ہیں۔ بچہ زندہ نہیں رہے گا"

"وہ زندہ رہے گا" نائلہ نے چیخ کر کہا "صرف تم یہ چاہتے ہو کہ وہ زندہ نہ رہے۔ مگر تمہارے چاہنے سے اب کچھ نہیں ہو گا" اس نے فون کو اپنے سامنے رکھ لیا۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے ڈاکٹر یوسف کا نمبر ملایا۔

بیس منٹ بعد یوسف کی کار کے رکنے کی آواز آئی۔ پھر وہ بیگ اٹھائے دروازے میں نمودار ہوا۔ نواز اس کے ساتھ نہیں تھا "ارے بھابی۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اتنی پریشانی" اس نے بچے کو دیکھنے کے بعد دوا لکھتے ہوئے کہا۔ "لاحول ولاقوۃ۔ بند کریں یہ رونا دھونا۔ سب خیریت ہے۔ نواز میرے ساتھ چلے۔ میں دوا دے دیتا ہوں۔ کدھر ہے وہ الو کا پٹھا۔ باپ بن گیا۔ فکر ذرا نہیں اولاد کی۔ ماں بننا بھی مصیبت ہے نہ بننا بھی"

"یوسف بھائی" نائلہ نے ڈرتے ڈرتے آنسو پونچھ کے کہا "اظہر زندہ تو رہے گا نا۔؟"

"کیا؟" یوسف نے سر اٹھا کے اسے دیکھا "یہ کیا احمقانہ سوال ہے؟ زندہ کیوں نہیں رہے گا۔ ایک دو دن ذرا خطرے کے تھے۔ صرف اس لیے کہ وزن چار پونڈ تھا۔ مگر اب تو اچھی پروگریس ہے۔ میرا خیال ہے بالکل نارمل"

"حق نواز تو شاید اسٹڈی میں ہوں گے۔ آپ کرم داد کو لے جائیں" نائلہ نے سکون کا سانس لیا۔

"فضول باتیں مت سوچا کریں" یوسف نے چلتے چلتے کہا "بے شک زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے مگر ہم بھی تو اپنی عقل۔ علم اور تجربے کی روشنی میں بات کرتے ہیں۔ اس کی عمر ہو گی پورے سو سال۔ لکھ لیجیے"

ڈاکٹر کی کوشش کے باوجود نائلہ مسکرا نہ سکی۔ وہ گود میں آنکھیں بند کر کے لیٹے ہوئے' اظہر کو دیکھتی رہی۔ اتنی کم عمر میں بچے کی صورت کے بارے میں قطعی فیصلہ مشکل ہوتا ہے۔ ابتدائی چند دنوں میں بچے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں لیکن اظہر کے نقوش واضح تھے۔ اس میں حق نواز کی جھلک بھی نہ تھی۔ اگر ممکن ہوتا تو رات کو بھی وہ اسے اپنے پاس سلاتی مگر حق نواز نے سختی سے کہا تھا کہ بچہ نرسری میں رہے گا۔ اپنے بھائیوں کے ساتھ۔ سگے بھائیوں کے ساتھ۔ فیڈ کا وقت ہو گا تو آیا لے آئے گی۔ اس نے فیصلہ سنایا تھا تو نائلہ حیرانی سے اس کی صورت کو دیکھتی رہی تھی۔ شادی

سے پہلے کا حق نواز کیسا تھا؟ اسے بالکل یاد نہیں آتا تھا۔ اگر وہ ایسا ہی تھا تو اس کی اپنی نگاہ کو اور عقل کو کیا ہوا تھا۔ کیا واقعی اسی کو مقدر کہا جا سکتا ہے۔ وقت کے ساتھ لوگوں کے چہرے بھی بدل جاتے ہیں۔

"ممی!" اکبر نے اس کے قریب آ کے کہا۔ "ہم منّے کو دیکھیں گے۔"

"ہم گود میں لیں گے۔" اصغر نے مطالبہ کیا۔ وہ مسکرائی۔ اسے ڈرنے کی یا فکرمند ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ واپس جا سکتی ہے۔ وہ ملازمت اسے پھر مل جائے گی۔ کرائے کا مکان بھی مل جائے گا۔ لیکن وہ دنیا کے سامنے راجہ حق نواز خاں کا اصل چہرہ بے نقاب کر دے گی۔ کہ عظیم مصنف، عظیم انسان، عظیم شخصیت ایک ڈھونگ ہے۔ "رات کو دادی اماں بھی منّے کو دیکھنے کے لیے آئی تھیں۔" اکبر نے کہا۔

"اور انہوں نے بھی منّے کو گود میں لیا تھا۔" اصغر نے اپنے حق میں دلیل دی۔

"وہ... تم کو کیسے معلوم؟" نائلہ کا حلق خشک ہونے لگا۔ "تم تو سو رہے تھے... اور آیا کہاں تھی؟"

"آیا سو رہی تھی۔ ہم منّے کے سونے پر جاگ گئے تھے۔" اکبر نے وضاحت کی۔ "دادی امّاں نے منے کو جھولے میں لٹایا اور چلی گئیں۔"

"دیکھو اکبر، وہ مر چکی ہیں... اور ان کو بہت پہلے مٹی کے نیچے دبا دیا گیا تھا۔ وہ منّے کو دیکھنے نہیں آسکتیں۔" نائلہ نے دونوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "اب صرف ان کی تصویر رہ گئی ہے۔ تم نے خواب دیکھا ہوگا۔"

"خواب کیا ہوتا ہے ممی؟" اصغر نے سوال کیا۔

"کچھ نہیں۔ بس آئندہ دادی اماں کی بات مت کرنا۔" نائلہ نے لاجواب ہو کر کہا۔ "لو... ادھر آؤ... منّے کو گود میں لو اور بھاگ جاؤ۔ منے کی طبیعت خراب ہے۔ اسے سونا ہے۔"

رات کو اس نے تینوں کو ساتھ ساتھ سوتے دیکھا۔ تینوں کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ حق نواز کی اسٹڈی میں اب بھی روشنی تھی۔ وہ اب بہت کم نظر آتا تھا، جو نائلہ کے لیے بڑے اطمینان کی بات تھی۔

چار بجے چیختی چلاتی آیا نے اسے بستر سے کھینچ لیا۔ اظہر مر چکا تھا۔ نواز اس وقت بھی اسٹڈی میں تھا۔ جسم کی تمام قوت کو مجتمع کرتے ہوئے اور اپنی قوت ارادی کو بروئے کار لا کے اس نے اپنے آپ کو اس جذباتی بحران سے گزرنے کا حوصلہ دیا۔ اور عقل و ہوش کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اس نے ڈاکٹر یوسف کو فون کیا۔ "یوسف بھائی!"

"بھابی؟" وہ نیم غنودگی کے عالم میں بولا۔ "خیریت؟"

"ہاں۔ تمہیں اطلاع دینا مقصود تھی کہ وہ جس کی زندگی کے لیے تم نے مجھے سو سال کی ضمانت دی تھی نا۔ وہ مر گیا ہے... ماں بننا اور نہ بننا۔ دونوں ایک جیسے عذاب ہیں۔ ہے نا!" وہ ہذیانی انداز میں ہنسی اور فون بند کر دیا۔ پھر اس نے ڈائرکٹری میں نمبر دیکھا اور اس ہسپتال کا فون ملایا جہاں اظہر نے "اسپیشل وارڈ" میں آنکھیں کھولی تھیں۔ وہ ایک وی آئی پی کا بیٹا تھا چار پونڈ چھ اونس کا۔ جس نے زندگی کی صعوبتوں سے نبرد آزمائی کا اولین امتحان آکسیجن ٹینٹ میں رہ کر پاس کیا تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر ڈاکٹر یوسف کے علاوہ پرائیویٹ کلینک کی ایمبولینس میں دو ڈاکٹر دو نرسوں کے ساتھ پہنچ گئے۔ انھوں نے مصنوعی تنفّس بحال کرنے، دل کو بجلی کے جھٹکے دینے اور انجکشن لگا کے مردہ جسم میں روح پھونکنے کی سعیٔ ناکام میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور بالآخر اپنا فیصلہ سُنا دیا۔ "موت کے اسباب قدرتی ہیں مسز نواز۔" سینئر ڈاکٹر نے اسے بڑے سلیقے سے سمجھانا شروع کیا۔ "پیدائش کے وقت کسی کو یقین نہیں تھا کہ بچّہ زندہ رہے گا۔ ہم نے پھر بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ہم معالج ہیں۔ مسیحائی کے اعجاز پر یقین رکھتے ہیں مگر زندگی اور موت پر اختیار نہیں رکھتے۔ اگر یہ بچّہ ایک ماہ اور گزار دیتا۔"

"تب بھی کیا ہوتا؟" اس نے بے خیالی میں کہا۔ "اظہر نواز مر گیا۔ ایرا غیرا، نتھو خیرا کوئی بھی مر جاتا۔ دنیا کو کیا فرق پڑتا۔ وہ خود بھی جی کے کیا کرتا؟"

سینئر ڈاکٹر نے بے بسی سے ڈاکٹر یوسف کی طرف مدد کے لیے دیکھا۔ "پلیز بھابی۔ حوصلہ رکھیے۔ نواز کہاں ہے؟"

"نواز... وہ شہرۂ آفاق مصنّف جو ہر عورت کے جذبات اور نفسیاتی مسائل کو سمجھنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔" وہ تلخی سے مسکرائی۔ "وہ اس وقت بھی ادب کا کوئی شاہکار تخلیق کرنے میں محو ہے۔ اس کی تخلیق میری اس تخلیق سے عظیم تر ہے نا۔ اظہر حمید کا باپ کہاں ہے اسے بلاؤ... وہ حق نواز بھی ہو سکتا ہے۔ مگر نام میں کیا رکھا ہے... وہ نام کما رہا ہے۔ کسی... بے وجود عورت کے جذبات کی عکاسی کر رہا ہے... یہ نام تو لوح جہاں پہ حرفِ مکرّر تھا... مٹ گیا..."

یوسف اسے کھینچ کر لے گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کے دماغ پر صدمے نے اثر کیا ہے۔ اسے خود معلوم نہیں کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ چلو اچھا ہوا کام آ گئی دیوانگی اپنی۔ وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے۔

دوپہر تک عملاً چند روزہ زندگی مستعار لانے والے اظہر (نواز یا حمید) کو حویلی کے احاطے ہی میں دفن کر دیا گیا۔ نواز نے اس سے بہت کچھ کہا۔ وہ سب جو اسے دنیا کے سامنے کہنا چاہیے

تھا۔ ایک اچھے انسان کی حیثیت سے۔ ایک اچھے شوہر اور ایک اچھے باپ کی حیثیت سے۔ نائلہ نے الفاظ کی کھوکھلی صدا نہ سُنی۔ اور نہ سمجھنے کی کوشش کی۔ صرف یوسف تھا جس کی زبان جذبات کی زبان تھی۔ اور اس کے دل کے بند دروازوں تک پہنچ رہی تھی۔ دوپہر کے بعد تک کمرے میں ایک بوجھل سکوت تھا۔ آسیب زدہ اور سوگوار۔ اکبر اور اصغر ماں کے پاس بیٹھے حیران ہو رہے تھے کہ خلافِ معمول آج اتنے لوگ جمع ہیں مگر کوئی شور نہیں ہے اور کوئی ہنس نہیں رہا ہے اور کسی کی طرف دیکھ نہیں رہا ہے۔ سوال اصغر نے کیا کیونکہ وہ چھوٹا تھا۔ "بھیا! کیا ہمارا مُنّا مر گیا ہے؟"

"ہاں۔ جیسے دادی اماں مر گئی ہیں۔ اس کو بھی زمین میں مٹی کے نیچے دبانے لے گئے تھے۔" اکبر نے کہا۔

"تو کیا اب وہ دادی اماں کی طرح ہم سے ملنے ہمارے کمرے میں آیا کرے گا؟"

"دادی اماں صرف مُنّے سے ملنے آتی تھیں۔" اکبر نے اُسے سمجھایا۔ "ہم سے نہیں۔"

"ریشماں۔" حق نواز نے خلافِ معمول بلند آواز میں کہا۔ "انھیں یہاں سے لے جاؤ۔"

"نہیں ریشماں۔ ان کو تو میرے پاس رہنے دو۔" نائلہ نے سکون سے کہا۔

ریشماں ان کے پاس بیٹھ گئی۔ "دادی اماں تم سے ملنے آتی رہیں گی بیٹا۔ جیسے پہلے آتی تھیں۔"

"ہاں۔" اصغر نے فاتحانہ نظروں سے اکبر کی طرف دیکھا۔ "وہ تو رات کو بھی آئی تھیں۔"

"ریشماں۔" حق نواز نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے اُسے تنبیہ کی۔ "کیا تم نے میری بات سنی نہیں تھی؟"

"ٹھہر جاؤ۔ ہاں اصغر!" نائلہ نے سخت لہجے میں کہا۔ "رات کو دادی اماں نے کیا کہا تھا تم سے؟"

"ہم سے؟... کچھ نہیں۔ بس انھوں نے مُنّے کو سر تک کمبل اُڑھایا تھا۔" اکبر نے وضاحت کی۔ "سردی تھی نا! اور اُس کے مُنہ پر تکیہ رکھ دیا تھا۔ وہ لات مار مار کے کمبل ہٹا دیتا تھا نا۔ دادی نے تکیے کو اچھی طرح دبا دیا تھا۔ ایسے۔" اُس نے ہاتھ رکھ کے وضاحت کی۔ "مُنّا رو رہا تھا۔ چُپ ہو گیا۔"

"دیکھا تم نے... میری رضیہ سب سے کتنا پیار کرتی ہے سب کی خبر گیری کرتی ہے۔" ریشماں نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

"اکبر۔ اصغر۔ چلو تم دونوں۔ جاؤ اپنے کمرے میں۔" حق نواز نے کھڑے ہو کر کہا۔ دونوں بچوں نے تعمیل کی۔

"میری رضیہ... میں تو جانتی ہوں، وہ یہیں ہے... میں اُسے آتے جاتے دیکھتی ہوں... مگر یہ سب... یہ کہتے ہیں میں پاگل ہوں۔" ریشماں نے نائلہ کے کان میں سرگوشی کی۔ "بچے تو جھوٹ نہیں بولتے نا۔"

"ہاں ریشماں۔ بچے جھوٹ نہیں بول سکتے۔ ایک بار میں نے سمجھا تھا کہ وہ خواب کی بات کر رہے ہیں۔ مگر وہ حقیقت تھی۔" نائلہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "جھوٹ سچ کا پتا تو چلانا ہی پڑے گا۔"

"جھوٹ سچ کا پتا چلانے کا انجام کیا ہوگا؟" نواز نے اس کے پیچھے آ کر اور کمرے میں پہنچ کر کہا۔

"تمھارا کیا خیال ہے، میں انجام سے ڈرتی ہوں؟" وہ اس اجنبی سے مخاطب ہو کے بولی جو خود کو اس کا شوہر کہلاتا تھا۔

"بچوں کی اس بات کا کسی نے سنجیدگی سے نوٹس نہیں لیا۔" نواز نے کہا۔ "ورنہ وہ کیا نتیجہ اخذ کرتے؟ کہ وہ میری ماں نہیں تھی۔ تم تھیں۔"

"نوٹس صرف میں نے لیا ہے۔" نائلہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "نتیجہ جو بھی ہوگا سامنے آ جائے گا۔ تمھاری ماں نے۔ جسے تم نے قتل کیا تھا۔ اپنا انتقام میرے بچے سے لیا ہے۔ رضیہ نے میرے بیٹے کا خون کیا ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" ریشماں ہذیانی انداز میں چلائی۔ "پتہ نہ جانے کب اُن کے پیچھے چلی آئی تھی۔" "میری رضیہ ایسی نہیں تھی۔ اس نے تو زندگی میں ایک چیونٹی کی جان بھی نہیں لی تھی... وہ صرف اپنے پوتے کو دیکھنے آتی تھی۔ وہ سراپا محبت تھی۔"

"ریشماں۔" وہ ہاتھ جو نائلہ کے مُنہ پر پڑنے والا تھا، گھوم کر اُس بڑھیا کے مُنہ پر لگا۔ "کُتیا! بھونکنا بند کر۔ دفع ہو جا یہاں سے۔" حق نواز نے دہاڑ کر کہا۔ اس کا جسم غصے سے کانپ رہا تھا اور چہرہ آتش فشاں بن گیا تھا۔

"نواز۔" یُوسف نے بروقت آ کے نواز کو قابو کر لیا۔ "چلو یہاں سے۔ تم سب کے اعصاب جواب دے چکے ہیں۔ تم سب پاگل ہو گئے ہو۔" اپنے جسم کی پوری قوت صرف کر کے وہ نواز کو گھسیٹ کر لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ جسمانی طور پر وہ نواز سے زیادہ صحت مند تھا، سمجھ دار تھا اور پرانے تعلق کی بنا پر معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے سکتا تھا۔

❁

"بورڈ کی رائے قطعی نہیں تھی جانِ من!" نواز نے نرمی سے کہا۔ "انھوں نے ایک شبہے کا اظہار کیا تھا کہ ناک کے نیچے والے زخم کے نشان کی نوعیت واضح نہیں۔ وہ طبعی بھی ہو سکتا تھا۔ لاش نکلوا کے پوسٹ مارٹم کرانے کے بعد تمھاری غلط فہمی دور ہو جانا چاہیے۔"

"دیکھو حق نواز۔ غلط فہمی سب کو ہوتی ہے۔ تمھیں دور سے دیکھنے والے سب غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔" نائلہ نے پُرسکون رہتے

ہوئے کہا۔ "میں بھی تھی۔ لیکن میری تمام زندگی غلط فہمی نہیں ہے۔ ہر بات جو میں سوچتی ہوں، سنتی ہوں، دیکھتی ہوں یا محسوس کرتی ہوں، غلط نہیں ہوتی۔ موجودہ حالات میں اگر میں یہ سمجھوں کہ ہم پھر پہلے کی طرح رہ سکتے ہیں۔ تمھارے خوبصورت لفظوں کے وعدوں پر اعتبار کر لوں یا مان لوں کہ ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کر سکتے ہیں اور خوش رہ سکتے ہیں تو یہ غلط فہمی دیوانگی ہی کہلائے گی۔"

"گویا تم نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میری یقین دہانی کے باوجود۔"

"تمھاری یقین دہانی میرے لیے بے معنی ہے۔ یہ میرا ذاتی فیصلہ ہے۔" نائلہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تم جانتی ہو کہ قانونی طور پر تم میری بیوی ہو۔ میری اجازت کے بغیر تم اس گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتیں۔" حق نواز کے غصے کی آگ بھڑکنے لگی۔

"تم بیسویں صدی میں بھی عورت کو بیوی کا درجہ دینے کے باوجود زرخرید سمجھتے ہو۔ ان سب چیزوں کی طرح جن کے تم مالک ہو۔" نائلہ نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں بھی کوئی چیز ہوں؟ تم مجھے بیچ سکتے ہو یا تحفے میں دے سکتے ہو؟ توڑ پھوڑ کے گلی میں پھینک سکتے ہو۔ جذبات۔ احساسات۔ عزتِ نفس۔ صرف تمھارے لیے ہیں؟"

"اچھا دیکھو۔ ہم یہاں سے چلتے ہیں۔ اس گھر کو چھوڑ دیتے ہیں۔ لاہور چلے جاتے ہیں۔" حق نواز نے یکلخت اپنا لہجہ بدل لیا۔ "وہاں تم اپنی پسند کے مطابق اپنا گھر خرید لینا۔ اپنے ذوق کے مطابق اس کی آرائش کر لینا۔ اپنی گاڑی خرید لینا جس میں تم کو کہیں بھی آنے جانے سے کوئی نہ روکے گا۔ پلیز میرے وعدے پر صرف ایک بار اعتبار کر لو۔ میں تم کو وہ سب کچھ دوں گا جو اب تک نہ دے سکا۔ لیکن خدا کے لیے مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ میں زندہ نہیں رہ سکوں گا تمھارے بغیر۔۔۔"

نائلہ ہنسی۔ "اور دنیا ایک عظیم مصنف سے محروم ہو جائے گی۔ اظہر۔ حمید کا بیٹا کہہ لو تم اسے۔ وہ زندہ رہتا تو کیا بنتا۔ بہت بڑا مصور۔ شاعر۔ ڈاکٹر۔ انجینیر۔ آنے والا لمحہ بے وجود ہے۔ اس پر وعدوں کی بنیاد رکھنے کی کوشش کرنا، ہوا میں خوابوں کے شیش محل بنانے کے مترادف ہے۔ میرا فیصلہ اٹل ہے۔ میں اکبر اور صغر کے ساتھ جا رہی ہوں۔۔۔"

"اچھا۔" حق نواز کھڑا ہو گیا۔ "میں تمھارا چیلنج قبول کرتا ہوں۔ تمھیں جانے کی اجازت ہے۔ لیکن اکبر اور صغر کو ساتھ لے جانا تمھارے لیے ممکن نہ ہو گا۔ قانونی طور پر ان کا باپ میں ہوں۔ حمید ہوتا تو شاید لے جاتا۔ مگر تمھارا اور اُن کا رشتہ صرف میرے تعلق سے قائم رہ سکتا ہے۔ اکبر سات سال کا ہو چکا ہے، اسے عدالت فوراً میری تحویل میں دے دے گی۔ صغر ساڑھے پانچ کا ہے۔ ڈیڑھ سال تک تم اسے رکھ سکتی ہو۔"

"نواز۔" وہ دہشت زدہ ہو کے چلائی۔ "اچھا دیکھو ہم کوئی سمجھوتا کر لیتے ہیں۔"

"سمجھوتے کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ ہم سب ایک ساتھ رہیں گے۔" حق نواز نے کہا۔ "میں تمھیں رعایت دے رہا ہوں تو صرف اس لیے کہ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے۔ ہماری نئی زندگی تمھاری مرضی اور تمھاری خواہش کے مطابق۔ میرے وعدے پر اعتبار کر کے تم خود کو بچا سکتی ہو۔ مجھے بھی۔ بچوں کو بھی۔" وہ پھر بیٹھ گیا۔ "میں بالکل بدل گیا ہوں نائلہ۔ تم دیکھ لو گی کہ میں وہ پہلے والا نواز نہیں۔ مجھے آزما کے تو دیکھو۔ میں تم سے محبت کی بھیک مانگتا ہوں۔ یہ تمھارے بس میں نہیں تو مجھے اپنی نفرت ہی دے دو۔ لیکن مجھ سے تو محبت کرنے کا حق مت چھینو۔ اگر میں شیطان ہوں تو صرف تمھاری محبت ہی مجھے انسان بنا سکتی ہے۔ بس ایک موقع اور دو مجھے۔"

"اچھا نواز!" نائلہ نے بہت دیر سوچنے کے بعد تھکے ہوئے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "میں ایک مرتبہ پھر آنکھ بند کر کے اپنی زندگی کا جوا کھیلتی ہوں۔۔۔"

ان کا تمام ضروری سامان پیک ہو چکا تھا۔ دو سوٹ کیس نائلہ نے خود پیک کیے تھے اور بڑی ہوشیاری سے اس میں اپنے کپڑوں کے ساتھ اکبر اور اصغر کے سب کپڑے بھی رکھ دیے تھے۔ اس کا سارا خوف اب دور ہو چکا تھا۔ وہ طے کر چکی تھی کہ حق نواز جیسے عیار شخص کو عیاری سے شکست دے گی۔ اس نے کرم داد کے ذریعے کراچی کی فلائٹ پر تین سیٹیں حاصل کر لی تھیں اور یہ ٹکٹ اس کے سوٹ کیس میں محفوظ تھے۔ حق نواز کو اس کا قطعی علم نہ تھا۔ اس نے لاہور کی فلائٹ کے لیے چار سیٹوں کا انتظام کیا تھا۔ دونوں فلائٹس تیس منٹ کے فرق سے روانہ ہوتی تھیں۔ لیکن کراچی کی فلائٹ پہلے جاتی تھی۔ ایئرپورٹ پہنچنے تک حق نواز کو اس کے عزائم پر شبہہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ بالکل ٹھیک وقت پر وہ حق نواز کو کچھ لینے کے لیے بھیج دے گی۔ مثلاً اسپرین۔۔۔ سر درد کے بہانے۔ وہ کہہ دے گی کہ مجھے پھر کچھ سر درد کے دورے کا شبہہ ہو رہا ہے۔ اسے کم سے دس منٹ لگیں گے اور اس کے واپس آنے تک وہ صرف اپنے دو سوٹ کیس اٹھا کے اور اپنے بچوں کو ساتھ لے کر ٹرمینل کراس کر جائے گی۔ حق نواز واپس آ کے انھیں ادھر اُدھر تلاش کرے گا۔ لیکن اسے یہ اندازہ کرنے میں دیر نہیں لگے گی کہ نائلہ اسے غچّہ دے کر نکل گئی ہے وہ فوراً دیکھ لے گا کہ دو ہی سوٹ کیس کم ہیں جو نائلہ نے خود پیک کیے تھے۔ آگے امکانات ففٹی ففٹی ہیں۔ اسے پہلا خیال یہ آئے گا کہ نائلہ بچوں کے ساتھ لوٹ گئی۔ اور اب راولپنڈی جانے کے لیے ٹیکسی میں بیٹھ چکی ہو گی یا بیٹھنے والی ہو گی لیکن اُسے دوسرا خیال یہ بھی آ سکتا ہے کہ وہ کسی دوسری فلائٹ سے تو نہیں

گئی۔ وہ معلومات کرے گا کہ کون سا جہاز پرواز کرنے والا ہے اور اُسے معلوم ہوجائے گا کہ نائلہ پہلی فلائٹ سے کراچی جارہی ہے مگر ... وقت وہ کیا کرے گا۔ اس کے لیے اندر آکے زبردستی کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوگا۔ اوّل تو اسے بیریئر سے آگے ہی کوئی نہ جانے دے گا۔ لیکن وہ دھاندلی... یا دھونس کے ذریعے اندر آ پہنچا تب بھی کچھ نہیں کر سکے گا۔ وہ حق نواز کو پہچاننے سے صاف انکار کردے ... سکندر زماں ہوں۔ میجر سکندر زماں کی۔ مسٹر آپ کسے ... ؟" وہ یقیناً مشتعل ہوجائے گا اور بچّوں سے بات کرے گا۔ اس... بچّوں کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ "یہ جو تمھارے ڈیڈی ہیں نا۔ انھوں نے ممّی کو مار دیا تھا۔ اب یہ ہمیں مارنا چاہتے ہیں۔ اب وہ خراب ہوگئے ہیں۔ ہم ان کو چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ اگر ہوائی اڈّے پر وہ تم سے کچھ پوچھیں۔ یا کوئی اور پوچھے تو ان کو بتا دینا کہ ہمارے ڈیڈی میجر ہیں۔ کہہ دینا ہم ان کو نہیں جانتے۔ بتاؤ کیا کہو گے؟ اور کیسے؟" مسلسل ہدایت اور ریہرسل کے بعد اکبر اور اصغر پرفیکٹ ہوگئے تھے۔ نائلہ کو یقین تھا کہ وہ صورتِ حال سے نمٹ لیں گے۔ وہاں ہر طرف سیکیورٹی گارڈ والے ہوتے ہیں حق نواز زبردستی نہیں کر سکے گا۔ اسے پولیس کے پاس جانے اور رپورٹ درج کرانے میں وقت لگے گا۔ اس وقت تک تو جہاز کراچی پہنچ چکا ہوگا۔

نائلہ کے پاس اپنے مکان کی فروخت سے حاصل ہونے والے تیس ہزار روپے الگ تھے۔ اتنی ہی مالیت کے زیورات اس کے اپنے تھے۔ کراچی میں ایک دور کا کزن تھا۔ وہ کار لیے موجود ہوگا۔ اور ایک آدھ دن میں کوئی کرایے کا مکان ملنے تک وہ اس کے گھر میں مہمان رہ سکیں گے۔ وہ کرم داد کو سامان رکھتے ہوئے دیکھتی رہی اور اس منحوس آسیب زدہ قاتل حویلی میں اپنی زندگی کے چند منٹ شمار کرتی رہی... اپنے بیڈ روم میں میز کی ہر دراز کو اس نے آخری بار دیکھا۔ کہیں اس کی کوئی تصویر تو نہیں رہ گئی۔ چیک بک۔ ٹیلی فون اور ایڈریس بک... سب وہ پہلے ہی رکھ چکی تھی۔ "اکبر... اصغر۔ تمھیں سب یاد ہے نا۔ دیکھو گھبرانا بالکل نہیں۔ میں تمھارے ساتھ ہوں۔" پھر یکلخت اس کی نگاہ گھڑی پر گئی۔ بیس منٹ میں کرم داد نے سامان لوڈ نہیں کیا تو وہ لیٹ ہوجائے گی۔

"کرم داد۔" اس نے چلّا کر کہا۔ "کیا دیر ہے اب۔ راجہ صاحب سے کہو دیر ہو رہی ہے۔ چلو تم دونو گاڑی میں جاکر بیٹھو۔" بچّوں نے سر ہلایا اور باہر دوڑ گئے۔ جہاز میں پرواز کے سنسنی خیز تجربے کے خیال سے وہ بہت خوش تھے۔ کرم داد ایک منٹ بعد نمودار ہوا۔

"آپ نے آواز دی تھی بیگم صاحبہ۔" وہ اس کے سامنے دست بستہ آکھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ اس کے غم کا آئینہ تھا۔ نائلہ کو اسے چھوڑنے کا تھوڑا سا دکھ ہوا۔

"دیکھو کرم داد۔ زندگی میں اچھے بُرے سب قسم کے لوگ ملتے ہیں اور بچھڑ جاتے ہیں۔" اس نے ناصحانہ انداز میں کہا۔ "تم میرے بہت قابلِ اعتماد دوست تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمھاری محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتی تھی۔ ہم سب ہی مجبوریوں کے جال میں اسیر ہیں۔ میرا ایک کہنا مانو گے۔ اس گھر سے نکل جاؤ۔ باہر جاکے دیکھو کہ دنیا کتنی خوبصورت ہے... تم میں اس دنیا کو تسخیر کرکے اپنی خواہش کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت ہے۔ تم بہت کامیاب رہوگے اور بہت خوش۔ اور تمھیں بہت سی لڑکیاں ملیں گی۔ مجھ سے لاکھ درجے بہتر۔ چاہے جانے کے قابل۔" اس نے پھر گھڑی دیکھی۔ "اب خدا حافظ۔ میری تمام نیک تمنائیں اور دعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔ راجہ صاحب سے کہو جلدی کریں۔"

کرم داد نے سر اٹھایا۔ "راجہ صاحب... وہ تو چلے گئے ہیں بیگم صاحبہ۔ ان کے جانے کے بعد ہی..."

"کہاں۔؟" نائلہ نے چلّا کر کہا اور باہر دوڑی مگر کار کی جگہ ٹائروں کے نشانات رہ گئے تھے۔ "کرم داد کہاں گئے ہیں راجہ صاحب۔ ایئرپورٹ تو تم کو جانا تھا۔ ڈرائیونگ تمھیں کرنا تھی۔ گاڑی واپس لانے کے لیے؟"

کرم داد کا چہرہ حیرت کی تصویر بن گیا۔ "مجھے... مجھ سے تو راجہ صاحب نے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی بیگم صاحبہ۔ انھوں نے کہا تھا وہ بچّوں کے ساتھ دو دن کے لیے لاہور جارہے ہیں۔ میری واپسی تک بیگم صاحبہ کا خیال رکھا جائے۔"

مات۔ بازی سے مات ہوگئی تھی۔ اس کی ٹانگوں سے جان نکلنے لگی۔ مگر وہ دیوانوں کی طرح اندر بھاگی اور ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا۔ پہلی بار اس کی انگلیاں سلپ کر گئیں۔ دوسری بار اس نے غلط نمبر ڈائل کردیا۔ پھر وہ بیٹھ گئی۔ اس نے دس مرتبہ گہرے لمبے سانس لیے اور پھر نمبر ملایا۔ "پولیس۔ دیکھیے میں مسز حق نواز بول رہی ہوں۔ مسٹر راجہ حق نواز۔ وہ بہت مشہور مصنف ہیں۔ وہ ابھی ابھی ایک سیاہ مرسیڈیز میں میرے دو بچّوں کے ساتھ ایئرپورٹ گئے ہیں۔ ان کو وہیں روکیے۔ گاڑی کا نمبر... لکھیے... اف... خدا کے لیے جلدی کیجیے۔ میں ایئرپورٹ آکے پوری بات بتا دوں گی۔"

وہ ریسیور رکھ کر دروازے کی طرف لپکی ہی تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ وہ پھرکی کی طرح گھوم کے واپس ہوئی۔ "ہیلو..." اس نے دھڑکتے دل کو سنبھال کے پُرامید لہجے میں کہا۔

"کس سے بات ہو رہی تھی۔" حق نواز کی آواز آئی۔ "لائن نہیں مل رہی تھی؟"

"اوہ۔ حق نواز۔" اس نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ "تم نے تو مجھے... خیر۔ کہاں سے بول رہے ہو۔؟ اچانک کہاں غائب ہوگئے تھے۔ بغیر کچھ بتائے۔ دیر ہو رہی ہے۔ میں بالکل تیار ہوں..."

"تیار رہو۔؟ اچھا تو لکھو۔" حق نواز نے تمسخر آمیز لہجے

میں کہا۔

"لکھوں؟ کیا لکھوں؟" نائلہ نے تعجب سے کہا۔

"جو میں کہوں۔ اور اسے مذاق مت سمجھو۔ تمھیں اپنے بچّوں کی زندگی عزیز ہے تو وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں ورنہ ساری عمر سر پر ہاتھ رکھ کے روتی رہو گی۔" وہ بولا: "اپنا پین نکالو اور ایک سادہ کاغذ لے لو۔۔۔"

نائلہ نے دیوار کا سہارا لیا۔ کمرہ اس کی نظروں کے سامنے ڈولنے لگا تھا جیسے زلزلے کی زد میں ہو۔

"تم خود کو بہت چالاک سمجھتی ہو نا۔ مگر دیکھ لو میں تم سے ایک قدم آگے ہوں۔ جو تم نے ابھی سوچا ہی تھا اس پر میں نے عمل بھی کر لیا۔" وہ بولا: "میری بات مانو گی تو کسی کو نقصان نہیں ہوگا۔ تمھیں یاد ہے ایک بار تم نے مجھے قاتل کہا تھا اور وہ بھی اپنی ماں کا۔ پھر تمھارے اس پرستار کرم داد نے بے ہوشی کے عالم میں بہت کچھ بتا دیا۔ جو وہ تم کو بتا چکا تھا۔ تم سمجھتی ہو مجھے ایک عورت کی چال سے مات ہو جائے گی۔ جو چیز میری ہو اُسے مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا نائلہ۔ میں تم سے واقعی محبّت کرتا ہوں۔ میری محبّت میں دیوانگی زیادہ ہے تو یہ محبّت تمھیں ایسے ہی قبول کرنا پڑے گی۔ تم مجھے چھوڑ کے نہیں جا سکو گی۔ دنیا کی نظر میں مجھے گرا کر مجھ سے انتقام نہیں لے سکو گی۔ اچھا اب لکھو۔"

"بولو۔۔۔" نائلہ نے کاغذ قلم لے کر شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "کیا لکھنا ہے؟"

"لکھو۔ ڈیئر نواز۔ مجھے احساس ہے کہ میرا حافظہ قابلِ اعتماد نہیں۔ میں سوتے میں چلتی ہوں اور مجھے پتا نہیں چلتا کہ میں کیا کر رہی ہوں۔ یہ سب سر کی پرانی چوٹ کے اثرات ہیں جو پوری شدّت کے ساتھ پھر نمودار ہو گئے ہیں۔ جب میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تمھاری عدم موجودگی میں حمید کے ساتھ کہیں نہیں گئی تھی تو میں نے جھوٹ بولا تھا۔ میں نے تار دے کر اسے بلایا تھا۔ اس کے ساتھ سلور گرل ریسٹورنٹ اور پھر سیروز سینما میں فلم "سمر آف مونٹی لو" دیکھنے گئی تھی۔۔۔ اس کے بعد وہ مجھے سوان ندی کی طرف لے گیا۔"

"حق نواز۔۔۔ میں یہ ہرگز نہیں لکھوں گی۔" نائلہ نے احتجاج کرتے ہوئے کہا مگر اس کا لہجہ بہت کمزور تھا۔

"وقت ضائع مت کرو۔" وہ برہمی سے بولا: "لکھو۔۔۔ وہ دست درازی میں حد سے گزر گیا۔ وہاں میری مدد کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اور میں چلّاتی تو رسوائی ہی کو آواز دیتی۔ میرا ارادہ اسے قتل کرنے کا نہیں تھا۔ لیکن اس کے سر پر پتھر زیادہ زور سے لگا۔ پتھر بھی بڑا تھا۔۔۔ وہ بعد میں مر گیا۔ کرم داد جانتا تھا کہ میں حمید کے ساتھ کہاں گئی تھی۔ اسے برطرف کرانے کے لیے گھوڑے کے دانے میں چوہے مار گولیاں خود میں نے ملائی تھیں۔ اپنے بچّے اظہر کو میں نے اس لیے مار دیا تھا کہ تمھیں اس پر اپنی اولاد نہ ہونے کا شک تھا اور اس شک سے ہماری ازدواجی زندگی تلخ ہو چکی تھی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ شک کی بنیاد کو ہی ختم کر دوں تاکہ تمھارا اعتماد پھر حاصل کر سکوں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ جو کچھ میں نے کیا اُسے کیوں کیا اور اچھا کیا یا بُرا کیا۔ میری ذہنی کیفیت کو نارمل نہیں کہا جا سکتا۔ مجھے اپنے قول و فعل پر اختیار نہیں رہا۔ مجھے معاف کر دو۔ میں تمھاری اور قانون کی نگاہ میں مجرم ضرور ہوں مگر مجھے تھوڑی سی رعایت تو ملنا چاہیے۔ لکھ لیا؟ اچھا اب اس کے نیچے دستخط کر دو۔ اور اسے وہیں رکھ کے میرا انتظار کرو کل تک۔" فون بند ہو گیا۔

نائلہ یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ وہ کتنی دور ہے اور کل کب تک آئے گا۔ وہ کرسی پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کچھ دیر بعد اس کی طبیعت کو تھوڑا سا قرار آ گیا۔ اطمینان کی بات یہ بھی تھی کہ حق نواز اور اکبر اصغر اسی شہر میں کہیں بہت قریب موجود تھے۔ وہ کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ اس نے مدد شاہ کو دروازے کی طرف جاتے دیکھا۔ ایک بار اُس نے پلٹ کر دیکھا تو نائلہ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بلایا مگر وہ پل بھر کے لیے رکا اور پھر بے تحاشا بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ سخت خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ "کرم داد۔ تمھارے باپ کو کیا ہو گیا ہے؟" اس نے پلٹ کر کہا۔

کرم داد اسی طرح پژمردہ اور سرنگوں کھڑا تھا۔ "کل۔۔۔ کل رات اس نے یہاں رضیہ کو دیکھا تھا۔ اس سے پہلے کئی بار۔ وہ سمجھا تھا کہ یہ اس کا وہم ہے۔ مگر کل رضیہ نے اسے اشارہ کر کے بلایا۔ وہ انھی کپڑوں میں تھی۔"

ایک حقیقت اچانک نائلہ پر عیاں ہو گئی۔ گذشتہ شب اس نے لباس تبدیل نہیں کیا تھا۔ جب اس نے مدد شاہ کو اسی طرح بلایا تھا۔ وہ ریشماں سے بات کرنا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے وہ رات کو ہمیشہ رضیہ کے کپڑوں میں ہوتی تھی۔ حق نواز نے روزِ اوّل ہی سے یہ بات منوالی تھی اور اس کا مقصد واضح تھا۔ رات کو وہ دیکھنے والوں کو بالکل رضیہ نظر آئے مگر دیکھنے والوں نے تو اُسے قبرستان کی طرف سے آتے دیکھا تھا۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رات کو سوتے میں قبرستان جا پہنچی تھی اور پھر واپس آ کے سو گئی تھی؟ اُسے واقعی نیند میں چلنے کا عارضہ دوبارہ لاحق ہو گیا ہے؟ قصوروار ریشماں نہیں۔ اس نے تو مجھے رضیہ ہی سمجھا ہوگا۔ اور بچّوں نے؟ انھوں نے دادی اماں کے لباس میں مجھے دادی اماں سمجھا؟ یا میرے خدا۔ وہ جھوٹ تو نہیں بول سکتے۔ میں نے خود اظہر کا گلا گھونٹ دیا تھا؟ مگر یہ کیسے ممکن ہے۔ میرے لاشعور میں کوئی خوف نہیں تھا۔ کوئی احساسِ جرم نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ حق نواز کا بیٹا ہے حمید کا نہیں۔

"کرم داد۔" اس نے اچانک کہا: "میرے یہاں آنے سے پہلے تمھاری ماں نے اور خود تم نے رضیہ کو دیکھا تھا۔۔۔؟"

کرم داد نے اقرار میں سر ہلایا: "میں ان چکروں میں نہیں پڑتا۔

لیکن میں اپنی آنکھوں دیکھے کو کیسے جھٹلاتا ۔۔ وہ سو فیصد رضیہ تھی۔ البتہ ... ایک بات مجھے ذرا عجیب ۔۔۔۔ اور مختلف لگی ۔۔۔ رضیہ کی چال ۔۔۔ وہ نہیں تھی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ کوئی عورت ۔۔۔ کوئی دوسری عورت میک اپ وغیرہ کی مدد سے رضیہ بن کے کوئی غلط کام کررہی ہے ۔۔۔ اور اس کھیل میں مجھے شامل کر لیا گیا ہے ۔۔۔ میری مرضی کے بغیر ۔۔ مجھے کچھ بتائے بغیر ۔۔۔ رات کو مجھے رضیہ بنا دیا جاتا ہے مگر وہ کون ہے جو میرا ڈبل پارٹ کررہی ہے؟" بے اختیار اس کا ذہن ریشماں کی طرف گیا جس کے سوا گھر میں کوئی عورت تھی ہی نہیں مگر اپنے خیال کو اس نے خود ہی مسترد کردیا۔ ریشماں نے رضیہ کو دیکھا ہی نہیں تھا کرم داد کو دکھایا بھی تھا۔ ظاہر ہے وہ کوئی اور تھی جو حق نواز کے عزائم کی تکمیل کے لیے آلۂ کار بنی ۔۔

آج تک اس نے حق نواز کی اسٹڈی میں قدم نہیں رکھا تھا۔ حق نواز اسے ادھر لے کر ہی نہیں گیا تھا اور نائلہ نے بعد میں نہ اس کی ضرورت محسوس کی تھی نہ اسے کبھی تجسس نے مجبور کیا تھا۔ لیکن اب اس نے طے کیا کہ یہ بھی حق نواز کی تہہ در تہہ غلافوں میں لپٹی ہوئی شخصیت کا ایک حصّہ ہے جس سے آشنائی کے لیے یہ آخری پردہ بھی ہٹ جانا چاہیے ۔۔ ویسے تو ہر آدمی کے کئی چہرے ہوتے ہیں۔ اور شخصیت کے کئی روپ ہوتے ہیں مگر ان میں اتنا تضاد ۔۔۔ یہ تصادم اور زمین سے آسمان کی بلندی اور پستی کا فرق نہیں ہوتا۔ دنیا کی نظر میں نسوانی جذبات کی عکاسی اتنے بھرپور اور دلکش انداز میں اور اتنے لطیف پیرائے میں کرنے والا مہذب مرد اندر سے ایک درندہ صفت شیطان کیوں ہے ۔۔ شرافت اور تہذیب کے اس پیکر میں چھپا ہوا وحشی اور بے ضمیر انسان کسی کو نظر کیوں نہیں آتا ۔۔ وہ کل تک انتظار کے سوا کچھ نہیں کرسکتی تھی اور اسے اتنا اطمینان بہرحال حاصل ہوگیا تھا کہ اپنے ناکردہ گناہوں کا اعتراف کرلینے کے بعد اس نے اپنے بچّوں کی زندگی بچالی ہے۔

دروازے پہ بہت مضبوط قفل تھا۔ وہ لوٹ کر گیراج میں آئی۔ وہاں بہت سے کاٹھ کباڑ میں اس کو لوہے کی ایک سلاخ مل گئی جو تقریباً تین فٹ لمبی تھی ۔۔ سلاخ کو کنڈے میں پھنسا کر اس نے دوسرے کنارے کو لیور کی طرح کھینچا ۔۔ نئے قفل کے مقابلے میں پرانے دروازے کی مزاحمت جواب دینے لگی۔ کنڈی مسلسل جھٹکوں سے ہلنے لگی اور پھر اس کا ایک قبضہ نکل گیا۔ کنڈی لٹکنے لگی ۔۔ دوسرا قبضہ اکیلا کب تک مقابلہ کرتا ۔۔ دو منٹ بعد نائلہ نے اسٹڈی میں قدم رکھا اور ادھر ادھر لائٹ کا سوئچ تلاش کیا۔ بٹن دباتے ہی رائٹنگ ٹیبل پہ آویزاں ڈبل ٹیوب لائٹ روشن ہوگئی ۔۔۔ نائلہ نے مختصر سے کمرے کا جائزہ لیا ۔۔ وال ٹو وال کارپٹ، صوفہ سیٹ، چھوٹا سا فریج ۔۔ الیکٹرک کیٹل اور چائے بنانے کے مختصر سے سامان پر مشتمل ایک کیبنٹ ۔۔ ٹرانسسٹر ریڈیو ۔۔ وال کلاک ۔۔ اس کمرے کی کل کائنات یہی تھی جس میں حق نواز کے باپ کی زندگی گزری تھی۔

نائلہ کو تھوڑی سی حیرانی ہوئی ۔۔ اس کا خیال تھا کہ تمام دیواریں فرش سے چھت تک کتابوں سے پُر ہوں گی ۔۔ ایک تعلیم یافتہ آدمی اور اتنے بڑے مصنّف کی اسٹڈی میں سب کچھ ہے مگر کتاب نہیں؟ پڑھے بغیر لکھنے کا شعور کہاں حاصل ہوتا ہے یا پختہ کہاں ہوتا ہے۔ وہ خود کتابوں کی دکان میں ملازمت سے پہلے فرصت کا تمام وقت پڑھنے میں صرف کرتی تھی ۔۔ لکھنے والا حال پہ نظر رکھتا ہے مگر ماضی کا علم تو کتاب ہی دیتی ہے۔ مستقبل کی بصیرت تو کتاب ہی سے ملتی ہے ۔۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور گھومنے والی کرسی پہ بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے میز پہ اونیکس کا بنا ہوا پورا رائٹنگ سیٹ تھا ۔۔ ٹیبل کیلنڈر تھا ۔۔ ایک خوبصورت اسٹینڈ میں حق نواز کی سات مطبوعہ کتابیں بڑے قرینے سے سجی ہوئی تھیں ۔۔ وہ میز بہت خوبصورت تھی اور بالکل کسی شوروم کی طرح سجی ہوئی تھی ۔۔ اس پہ کوئی نامکمل مسوّدہ تو کیا ایک کاغذ بھی نہیں تھا جس پہ کسی تحریر کا نشان ہو۔

ایک بار پھر وہی سلاخ کام آئی اور نائلہ نے دراز کی ہر کنڈی توڑ دی ۔۔ پیتل کی نازک سی کنڈیاں اس آہنی سلاخ کے ایک جھٹکے میں باہر نکل آئیں ۔۔ سب سے اوپر والی دراز خطوط سے بھری پڑی تھی۔ سب تعریفی خطوط تھے اور بہت سے خطوط میں اس پہ غائبانہ عاشق ہونے والی لڑکیوں نے اپنی تصاویر بھی ارسال کی تھیں ۔۔ کچھ آٹوگراف کے لیے ۔۔ کچھ برائے ملاحظہ ہمراہ درخواست شادی منسلک ہیں اگر قبول افتد زہے عزو شرف"، کے مضمون سمیت ۔۔ غور کرنے پر اسے تسلیم کرنا پڑا کہ ان میں بہت سی لڑکیاں ناقابلِ بیان حد تک خوبصورت تھیں۔ کچھ واقعی بہت بڑے گھروں کی عزت تھیں ۔۔۔ قدرِ مشترک صرف حق نواز کا عشق تھا اور ان کی احمقانہ جذباتیت تھی ۔۔ اُن کو معاف کردے خداوندا کیونکہ یہ نہیں جانتے یہ کیا کررہے ہیں ۔ مصلوب ہونے سے پہلے مسیح نے دعا کی تھی جو نائلہ کو ان لڑکیوں کے خطوط پڑھ کے یاد آئی۔ وہ لاعلم تھیں اور ان کا قصور ان کی معصومیت اور بے خبری تھی ۔۔ جس حق نواز کو نائلہ نے بھگتا تھا وہ ان کے لیے تصوّراتی مرد تھا ۔۔ وہ آئیڈیل جو رومانی فلموں اور ناولوں میں خیالی اور جسے ذہن میں رکھ کے لڑکیاں، زنانہ قسم کے ناولوں میں آئیڈیل کی تلاش کے لیے خط لکھتی ہیں۔ حقیقت کی سنگلاخ زمین خوابوں کی دھنک سے کتنی مختلف ہوتی ہے۔ تصوّر کی پرواز محبوب ہوتا ہے ۔۔ ہمہ صفت، مثالی اور خوابوں کی تعبیر کے عین مطابق۔ اور جسے ذہن میں دھنک سے کتنی مختلف ہوتی ہے۔ تصوّر کی پرواز خواب میں تو قوسِ قزح کے سارے دلکش رنگوں میں اڑا کے لے جاسکتی ہے مگر آنکھ کھلنے پر تو وہی دنیا ہوتی ہے جس سے فرار محض آرزو کی بات نہیں ۔۔

لیکن سب سے زیادہ غور طلب بات یہ تھی کہ حق نواز نے واقعی ان میں سے کسی کو شریکِ حیات منتخب نہیں کیا جو لاکھوں میں ایک

تھیں۔ اور اس کی وجہ بھی صاف ظاہر تھی۔ ان میں سے کوئی حق نواز کی ماں کا نقشِ ثانی نہیں تھی۔ یہ صرف نائلہ کی بدبختی تھی کہ وہ دوسری رضیہ سلطانہ بنی اور حق نواز جو ایک بار اُسے قتل کر چکا تھا۔ اسے پھر اپنے مقابل زندہ پا کے اس سے دوسری بار اپنے احساسِ محرومی کا انتقام لینے پر تل گیا۔ پھانسی تو کسی کو بھی دوبارہ نہیں دی جا سکتی لیکن حق نواز نے اس عورت کو قتل کرنے کے بعد پھر سزا دے کر اور عذاب میں مبتلا کر کے اپنے بیمار ذہن کے لیے تسکین کا سامان فراہم کیا۔ اس شکل و صورت کی ایک عورت نے اس کے باپ سے نفرت کی تھی اور اپنی مرضی کے خلاف اس کو جنم دیا تھا۔ اس نے اپنی تمام محبت اُسے دی تھی جس سے حق نواز کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ جو اس کے مرحوم باپ کا رقیب ہوا تھا۔ وہ خود اپنے باپ کا نقشِ ثانی تھا۔ اس نے وہی کیا جو اس کا باپ کرتا۔ ایک بار رضیہ کے ساتھ۔ ایک بار نائلہ کے ساتھ۔ شیکسپیئر فرما گیا ہے تاکہ نام میں کیا رکھا ہے۔

نیچے کی دوسری دراز میں سادہ کاغذات کے اوپر ایک نامکمل مسودے کے صفحات رکھے تھے۔ نائلہ نے ان صفحات کو نکال لیا۔ تحریر حق نواز ہی کی تھی۔ اس کے نئے ناول کے کسی باب کا یہ حصہ پڑھ کے وہ دریائے حیرت میں ڈوب گئی۔ کتنے اعلیٰ و ارفع خیالات تھے۔ کیا خوبصورت اسلوب تھا۔ عورت کے جذبات کی کیسی حقیقی اور جاندار تصویر تھی۔ یقین کرنا مشکل تھا کہ جس مرد نے ایک عورت کی زندگی کو جہنم بنا دیا۔ وہ عورت کے بارے میں۔ اس کی مظلومیت کے بارے میں اور معاشرے میں اس کے ساتھ ہونے والی ہر ناانصافی کے بارے میں یہ احساسات رکھتا ہے۔ اس نے چند صفحات پڑھنے کے بعد مسودہ رکھ دیا۔ سب سے نیچے والی دراز میں دہرا قفل تھا۔ کنڈی ٹوٹ گئی تھی مگر دراز میں فٹ ہونے والا تالا اب بھی لگا ہوا تھا۔ نائلہ نے اوپر کی دراز کو کھینچ کر باہر رکھ دیا۔ خلا میں ہاتھ ڈال کے اس نے نیچے کے حصے کی تلاشی لی اور نچلی دراز کھولے بغیر کاغذات نکال لیے۔

ایک مسودہ جو بہت پرانے کاغذ پر لکھا ہوا تھا گول کر کے ربر بینڈ سے باندھ دیا گیا تھا۔ نائلہ نے ربر بینڈ ہٹایا تو خستہ کاغذ ٹوٹنے لگا۔ اس نے احتیاط سے صفحات کو سیدھا کیا۔ اس پر لکھے ہوئے حروف کی روشنائی بھی دھندلا پڑ گئی تھی۔ یہ تحریر حق نواز نہیں تھی بلکہ مخصوص زنانہ ہینڈ رائٹنگ میں تھی۔ شاید کسی نوآموز نے اپنا مسودہ ایک عظیم مصنف کو نظرِ ثانی کے لیے بھیجا ہو۔ بزعمِ خود مصنف کہلانے والے تو ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ نائلہ نے خاصی کوشش کے بعد پہلے صفحے کی چند سطریں پڑھیں۔ پھر اس کے ذہن میں ایک کھٹکا ہوا۔ اس نے آگے پڑھنا شروع کیا۔ اس کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ درمیانی دراز اس کے دائیں ہاتھ پر پڑی تھی۔ نائلہ نے جھک کر اوپر سے مسودہ اٹھا لیا جو حق نواز نامکمل چھوڑ گیا تھا۔ اس نے دونوں کے پہلے صفحے ساتھ ساتھ رکھ کے ایک بار پھر پہلی سطر سے شروع کیا اور آخر تک پڑھ گئی۔ دونوں صفحات کے مضمون میں زیر زبر پیش کا فرق تک نہ تھا۔

نائلہ نے دوسرا اور پھر تیسرا صفحہ دیکھا مگر دونوں مسودے ایک تھے۔ فرق صرف کاغذ کا تھا یا مردانہ اور زنانہ ہینڈ رائٹنگ کا اور نئے پرانے کا۔ حق نواز اس پرانے مسودے کی نقل کر رہا تھا۔ نائلہ نے پرانے مسودے کے باقی صفحات تلاش کیے مگر ابتدائی صفحات غائب تھے جن سے معلوم ہو سکتا تھا کہ یہ عورت کون ہے جس نے اپنی تحریر حق نواز کو بھیج دی۔ کیا حق نواز نے اس سے یہ ناول خرید لیا تھا، وہ کوئی مجبور اور غریب عورت تھی جسے خدا نے لکھنے کی صلاحیت تو دی تھی مگر اشاعت کی استطاعت نہیں دی تھی۔ اور حق نواز یہ ناول اپنے نام سے شائع کرانا چاہتا تھا چنانچہ وہ اس کی نقل کر رہا تھا۔ مگر ایسی بے وقوف عورت کون ہو سکتی ہے جو اپنی تخلیق کسی اور کو بخش دے۔ عزت، شہرت اور دولت جو اُسے مل سکتی ہے وہ کسی غیر مرد کو دے دے۔ اس میں مجبوری کی کون سی بات ہے۔ وہ خود اپنا مسودہ کسی پبلشر کو بھیج دیتی تو اسے سب کچھ مل جاتا۔ معاوضہ بھی۔ حقوقِ اشاعت بھی۔ پھر کیا بات تھی؟ کیا اس میں اتنی ہمت نہیں تھی۔؟ ایک پرانی آواز کی بازگشت سے اس کے ذہن میں ایک دھماکہ ہوا۔ "بات ہمت کی نہیں تھی بیگم صاحبہ، اجازت کی تھی۔۔۔"

نائلہ نے سلاخ اٹھائی اور فتح کے یقین کی قوت کے ساتھ دوسرے کمرے کے دروازے پر حملہ کیا۔ دروازہ کھل گیا۔ یہ بابِ طلسمات تھا۔ علی بابا اور چالیس چوروں کا دروازہ تھا۔ یہ کمرہ پنڈورا کا باکس تھا۔ لیکن دروازے سے اندر قدم رکھتے وقت نائلہ کو کہاں معلوم تھا کہ اس کی دیواروں میں ماضی، حال اور مستقبل کے عفریت مقید ہیں۔ اس نے تو کمرے کی بے سروسامانی پر تعجب کیا۔ کمرے کا پلستر اکھڑ رہا تھا۔ فرش پر گرد تھی۔ دیواروں پر مکڑی نے جالے تن رکھے تھے اور یہ کمرہ گزرے ہوئے نصف صدی کے وقت کا مدفن تھا۔ کمرے میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ایک کونے میں صندل کی لکڑی کا بنا ہوا خاصا بڑا صندوق رکھا تھا اور اس کی مہک محبوس ہوا میں بھی بسی ہوئی تھی۔ دوسرا ایک جدید قسم کا سوٹ کیس تھا جس کا قفل نمبر والا تھا۔ نائلہ نے صندل کی لکڑی کے منقش ڈھکنے والے صندوق کے قفل پر غور کیا۔ اگر اس کے پاس چابیاں ہوتیں تو وہ اتنے خوبصورت اور قیمتی صندوق کو تباہ نہ کرتی جسے اس جیسی ہی ایک عورت نے بڑے شوق اور ارمانوں کے ساتھ بنوایا ہوگا۔ لیکن اب لوہے کی سلاخ استعمال کیے بنا چارہ نہ تھا۔ اس نے سلاخ کو کنڈی میں فٹ کیا اور کھینچا۔ خشک لکڑی نے چیخ کر فریاد کی اور اس کا ایک حصہ ٹوٹ کر الگ ہو گیا۔ نائلہ کو یوں لگا جیسے رضیہ کی ملامت بھری نظریں اسے ہر طرف سے گھور رہی ہیں۔ دیواریں صدا دے رہی ہیں۔ چور۔ چور۔ نائلہ نے ہمت کر کے صندوق کے اندر نگاہ ڈالی اور دنگ رہ گئی۔ اس میں کپڑے یا زیور جیسی کوئی چیز نہیں تھی۔ دائیں اور بائیں جانب پرانے کاغذات پر تحریر شدہ مسودے ایک دوسرے کے اوپر بڑی ترتیب سے جما کر رکھ دیے گئے تھے۔

نائلہ نے بائیں جانب کے ڈھیر پر سے پہلا مسودہ اٹھایا۔ تحریر رضیہ سلطانہ کی ہی تھی۔ اور یہ مسودہ مکمل تھا چنانچہ آغاز میں ناول کا نام بھی لکھا ہوا تھا اور بائیں طرف مُصنفہ کا اپنا نام بھی۔۔۔ نائلہ نے اس کے دو ہی صفحے پڑھے تھے کہ حقیقت اس پر اظہر من الشمس ہو گئی۔۔ یہی ناول ایک مختلف نام سے شائع ہونے والا ناول تھا جس میں "مُصنّف" راجہ حق نواز خان نے ماں سے عقیدت و محبّت کے جذبات کا اظہار یوں کیا تھا کہ انتساب اس کے نام کیا تھا۔ اور پہلی بار ماں کی تصویر بھی کتاب میں شامل کر دی تھی۔ یہ حق نواز کا ساتواں ناول تھا جس نے اس کی شہرت کو بامِ عروج پر پہنچا دیا تھا۔ نائلہ نے اس کا مکمل مسوّدہ پوری احتیاط کے ساتھ رکھا اور اس کے نیچے رکھا ہوا پلندہ اٹھا لیا۔ یہ راجہ حق نواز خان کا چھٹا فقیدالمثال ناول تھا جو رضیہ سلطانہ نے تیس سال قبل لکھا تھا: اس وقت یہ عورت عصمت چغتائی بننے کی ہمت نہیں رکھتی تھی بیگم صاحبہ۔۔۔ کرم داد کی آواز اس نے بہت قریب سے سنی۔ اور شوہر نے تو ان کے لکھنے پر بھی قدغن لگا دی تھی کہ اس سے خیالات گمراہ ہوتے ہیں۔۔ ان کی اشاعت کا کیا سوال۔۔۔ وہ سب مسوّدے خاک ہوئے۔ میں نے سنا ہے ان کو رضیہ سلطانہ کے ساتھ ہی دفن کر دیا گیا تھا۔۔؟"

"نہیں کرم داد"۔ نائلہ نے بآوازِ بلند کہا۔ "راجہ حق نواز نے صرف ماں کو دفن کیا تھا۔ اس کے مسوّدوں کو نہیں۔۔ وہ مسوّدے خاک نہیں ہوئے۔۔ انھوں نے حق نواز خان کو شہرتِ دوام عطا کی ہے۔۔ دنیائے ادب میں لازوال حیثیت دی اور وہ سب کچھ دیا جو رضیہ سلطانہ کا حق تھا"۔ نائلہ نے یکے بعد دیگرے دوسرے مسوّدے دیکھے۔۔ بائیں جانب کے اوپر تلے رکھے ہوئے سات مکمل مسوّدے وہ تھے جو راجہ حق نواز خان کے نام سے شائع ہو چکے تھے۔ ان سب پر رضیہ سلطانہ کا نام تھا جس نے اپنے ناولوں کا نام مختلف رکھا تھا۔ یہ سب پرانے نام تھے۔ "آہِ نارسا" جو حق نواز نے "آتش فشاں کی پکار" کے نام سے شائع کرایا تھا۔ رضیہ کی "مظلوم محبت" کو "لوحِ مزار" کے نام سے اور "چراغِ کشتہ" کو "بجھے دیے کی لَو" کے نام سے شائع کیا گیا تھا۔۔۔ کیا ماہرین پرانے کاغذات اور پرانی سیاہی سے اندازہ کر لیں گے کہ یہ مسوّدے کتنے پرانے ہیں؟ اس نے سوچا اور نیچے کا وہ مسودہ اٹھایا جو ابھی تک کتابی صورت میں دنیا کے سامنے نہیں آیا تھا۔ رضیہ سلطانہ نے کل بارہ ناول لکھے تھے۔ ان میں سے پانچ ابھی تک راجہ حق نواز کے پاس مستقبل کی ضمانت کے طور پر محفوظ تھے۔

اس نے دائیں جانب کے کاغذات میں سے پہلا پلندہ اٹھایا۔ ایک بار پھر اُسے شدید حیرت کا سامنا ہوا یہ تحریر رضیہ سلطانہ کی نہیں۔ خود حق نواز کی تھی۔۔ اس نے پہلے مسوّدے کو پڑھنا شروع کیا۔۔ اس میں اندازِ بیان بالکل مختلف تھا۔ بھونڈا۔۔ بے ربط اور کہیں کہیں غیر شائستہ۔ جیسے جیسے وہ پڑھتی گئی اس پر ایک خوفناک حقیقت واضح ہوتی ہو گئی۔ یہ اس کی اپنی کہانی تھی۔۔ جو نائلہ نام کی ایک لڑکی سے ملاقات سے شروع ہوئی تھی۔۔ وہ مسودہ لے کر باہر والے کمرے میں آ گئی اور کرسی پر بیٹھ کے پڑھنے لگی۔۔ آدھے گھنٹے بعد اُس نے محسوس کیا کہ وہ کانپ رہی ہے۔۔ یہ سردی کا اثر نہیں تھا۔ اس نے ابھی ابھی ایک نامکمل مسودہ پڑھنا ختم کیا تھا۔ اس میں حمید اور اظہر کے قتل کے تمام واقعات ایک ہی مسلسل کہانی میں آ گئے تھے مگر یہ کہانی ابھی اپنے اختتام کو نہیں پہنچی تھی چنانچہ ناول بھی نامکمل تھا۔ لیکن یہ راجہ حق نواز کے تمام جرائم کا مکمل اعتراف تھا۔ جو اس نے نائلہ سے شادی کے بعد کیے تھے۔

وہ مسوّدے کو بغل میں دبا کے گرتی پڑتی گھر کی جانب بھاگی۔۔ ایک مرتبہ پھر اس کے لیے ٹیلی فون کا نمبر ملانا دشوار ہو گیا۔۔ مگر اب اس کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ "ہیلو۔۔ پولیس اسٹیشن۔۔ دیکھیے یہاں ایک قتل ہو گیا ہے۔۔ جی آپ پتا لکھیے۔۔ میں نائلہ بول رہی ہوں۔۔ مشہور مُصنّف راجہ حق نواز خان کی وائف۔۔۔"

"جی؟ ابھی۔۔۔ کچھ دیر پہلے۔۔۔"

"جی میں نے ہی فون کیا تھا۔ اغوا کرنے والے نے ہی قتل کیا ہے۔ اب آپ ائیرپورٹ کا خیال چھوڑیے اور ادھر پہنچیے۔" اس نے عجلت میں کہا اور ریسیور رکھ دیا۔۔ اس کے جھوٹ کے بغیر وہ دوڑتے ہوئے کہاں آتے۔۔!

"یوسف بھائی۔۔۔ مجھے میرے بچّے ملنا چاہییں۔" وہ ڈاکٹر یوسف کے کندھے پر سر رکھے بیٹھی رہی۔

"بچّے بالکل خیریت سے واپس آ جائیں گے۔" یوسف نے گولیاں ہتھیلی پر رکھ کے آگے بڑھائیں۔ "پہلے تم یہ کھا لو۔"

نائلہ نے ہاتھ مار کے گولیاں گرا دیں۔ "تم مجھے سلانا چاہتے ہو؟ جانتے بوجھتے میں آنکھیں بند کر لوں کہ خطرہ ٹل گیا؟ میں کوئی دوا نہیں کھاؤں گی یوسف بھائی۔۔ تم نے تو اظہر کے بارے میں بھی کہا تھا کہ وہ سو سال جیے گا۔"

"مسز حق نواز۔۔" ڈی ایس پی نے مسوّدہ پڑھتے پڑھتے نظر اٹھائی۔ "آپ کے بچّوں کی زندگی کی ضمانت آپ کے رویّے پر ہے۔ آپ کے تعاون نہ کرنے سے ان کی جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔۔ آپ پُرسکون رہیے۔۔ بالکل نارمل۔۔"

"میں بھی سکون آور گولیاں ہی دے رہا تھا۔ تم ذہنی و اعصابی کشیدگی پر قابو پائے بغیر کچھ نہیں کر سکو گی۔" ڈاکٹر یوسف نے خفگی سے کہا اور اپنے بیگ میں سے دو گولیاں اور نکالیں۔ "تمہارا کیا خیال ہے ایسے وقت میں ہم تم کو سلا دیں گے۔ فون پر بات تو تم کو ہی کرنا ہے۔"

نائلہ نے خاموشی سے دونوں گولیاں اٹھا لیں اور پانی کا گلاس اٹھا کے حلق سے اتار لیں۔۔

"میں اب تک تین مسودے پڑھ چکا ہوں۔" ڈی ایس پی نے کہا جسے اس کیس میں بطورِ خاص بھیجا گیا تھا۔ "ان کا تعلق نواز کے بچپن سے ہے۔ ان میں صرف نفرت ہے۔ انتقام کی آگ ہے۔ خون کی پیاس ہے۔ اس شخص کے لیے جسے حق نواز اپنا بھی رقیب سمجھتا تھا۔

لیکن اس سے زیادہ وہ اپنی ماں کو قصوروار سمجھتا تھا۔ چنانچہ یہ ایک ہی سلسلے کے تین ناول ہیں۔ ان میں سے کسی کی اشاعت کا کوئی سوال نہیں۔ حق نواز کو لکھنا نہیں آتا۔ جابجا اس نے اپنے سوتیلے باپ کو غلیظ اور فحش گالیاں دی ہیں۔ اپنی ماں کے بارے میں ناقابلِ اشاعت باتیں لکھی ہیں۔ اور آخری حصے میں اس کے قتل کا اعتراف کیا ہے۔ طریقۂ واردات کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ یہ حق نواز تو نفسیاتی مریض نہیں ایک خطرناک مجرم تھا۔ آپ خوش قسمت ہیں جو ابھی تک زندہ ہیں۔ اس کی ماں کا نقشِ ثانی ہونے کے باوجود لیکن یاد رکھیے اب آپ کو وہی کرنا ہے جو ہم نے بتایا ہے حق نواز کا ٹیلی فون آئے تو آپ کو مصالحانہ رویہ رکھنا ہے۔ ہم نے ابھی رپورٹ کو ٹاپ سیکرٹ رکھا ہے۔ آپ اس ماں کا کردار ادا کریں گی جو اپنے بچوں سے ملنے کے لیے ہر جائز و ناجائز مطالبے پر سرِ تسلیم خم کرنے کو تیار ہو۔"

نائلہ نے اقرار میں سر ہلایا۔ گولیوں کے اثر سے اس کا اضطراب اور بے چینی بہت کم ہو گئے تھے۔ اپنے بچوں کی زندگی کی خاطر وہ مشکل سے مشکل کردار ادا کرنے کے لیے تیار تھی۔ ڈی ایس پی جو تھا مسودہ پڑھنے میں محو ہو گیا۔ یہ سب کتابی صورت میں شائع ہوتے تو سوا سو ڈیڑھ سو صفحات کے ناول ہوتے۔ خود نائلہ نے ان کو آدھے آدھے گھنٹے میں ختم کر لیا تھا۔ پڑھتے پڑھتے اس کو اتنی مشق ہو گئی تھی کہ ایک گھنٹے میں وہ ڈھائی تین سو صفحے پڑھ جاتی تھی۔ یہ ڈی ایس پی بھی اس سے کم نہیں معلوم ہوتا تھا اور سطروں پر نظر ڈال کے مفہوم کو... ذہن نشین کرتا جا رہا تھا۔

"یہ ایک اور قتل کا کیس ہے" اس نے آدھے گھنٹے بعد کہا۔ "حق نواز کی ماں کی قبر کے ساتھ کوئی ایسی قبر بھی ہے جس پر کوئی کتبہ نصب نہیں۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔" نائلہ نے کہا۔ "کس کی قبر ہے وہ۔۔۔؟"

"ایک خادمہ ہے۔ ریشماں" ڈی ایس پی نے کہا۔ "اس کی کوئی لڑکی تھی۔ جوان ہوتے ہی حق نواز نے اس سے مراسم استوار کر لیے۔ جب تعلقات کے نتائج سامنے آنے کا خطرہ لاحق ہوا تو اس نے لڑکی کو مار کے دفن کر دیا۔ وہ خادمہ سمجھتی ہے...."

"تم۔۔۔ تم جھوٹ بولتے ہو" ریشماں نے ایک ہذیانی چیخ ماری "تم سب کتے ہو۔ بھونکتے ہو۔ وہ اپنے گھر میں آباد ہے۔ اس کا شوہر اس سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس کے بچے ہیں" وہ چائے کی ٹرے سمیت کھڑے کھڑے گری۔

ٹیلی فون کی گھنٹی نے چلانا شروع کیا۔ نائلہ پہلے ریشماں کی طرف لپکی۔ رکی۔ اور پلٹ کر ٹیلی فون کی طرف گئی ڈاکٹر یوسف نے کرم داد کی مدد سے ریشماں کو اٹھا کے صوفے پر لٹا دیا تھا۔ "ہیلو۔۔۔ نواز۔۔۔؟" نائلہ نے کہا۔

"بہت بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں۔۔۔" وہ ہنسا "رات کو نیند بھی آئی تھی کہ نہیں۔۔۔؟"

"دیکھو نواز۔۔۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ تم نے جو کہا میں نے وہی کیا۔" نائلہ نے محسوس کیا کہ اس کے جذبات اداکاری پر مبنی نہیں بلکہ حقیقی ہیں۔ "مجھے تمہاری ہر شرط قبول ہے۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ جیسے تم چاہو گے۔ وہ سب کچھ بھول جاؤں گی جو اب تک ہوا۔ صرف ایک بار مجھے معاف کر دو۔ مجھے ایک موقع بخش دو...."

سر کے اشارے سے ڈی ایس پی نے اس کی اداکاری کو سراہا۔ اور ٹیپ ریکارڈر کو دیکھتا رہا جو ٹیلی فون کی گھنٹی بجتے ہی چل پڑا تھا۔ ٹیلی فون آبزرویشن پر تھا۔ ایکسچینج میں بھی نوٹ کر لیا گیا ہو گا کہ کال کہاں سے کی گئی ہے۔

"وہ تحریر تمہارے پاس ہے نا؟ یاد رکھو پولیس کو اطلاع دی تو میں اکیلا واپس آؤں گا۔ اور تم میرے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کر سکو گی۔" وہ بولا۔ "میں نے لاہور کے ایک ہوٹل میں پہلے سے ریزرویشن کروائی تھی۔ ہوٹل والے گواہ ہوں گے کہ حق نواز صاحب یہاں مقیم تھے۔ ہوٹل کا منیجر میرا زبردست مداح ہے۔۔۔ اور ریسیپشنسٹ پر موجود رہنے والی دو لڑکیاں بھی۔" وہ ہنسا۔ "پھر تم کو بتانا پڑے گا کہ بچے کہاں گئے۔ اس تحریر کے میرے قبضے میں آجانے کے بعد تمہاری پوزیشن کیا ہو گی۔ یہ اندازہ خود تم بھی کر سکتی ہو۔" پس منظر میں نائلہ اصغر کے رونے کی آواز پر غور کرتی رہی۔

"نواز۔ میں ان بچوں کی زندگی کی قسم کھا سکتی ہوں جن سے زیادہ مجھے کوئی چیز پیاری نہیں۔" وہ بولی۔ "میں نے کسی سے بات تک نہیں کی۔" (میرے جھوٹ کو معاف کرنا میرے معبود۔ زندگی بچانے کے لیے تو نے حرام کو بھی حلال کیا ہے)۔

"اچھا۔ میں ابھی دو گھنٹے میں آ رہا ہوں۔ اگر مجھے ذرا بھی گڑبڑ نظر آئی تو نقصان کی ذمے دار تم ہو گی۔ آواز سنو گی ان کی۔۔۔؟ اپنے بچوں کی۔۔۔ لو سنو۔۔۔"

"ممی۔۔۔" اکبر کی روتی ہوئی آواز آئی۔ "ہمیں بلا لیجیے۔ ہم کل سے بھوکے ہیں۔ اصغر بھی رو رہا ہے۔"

"بس بیٹے۔" نائلہ نے دل میں پیوست ہونے والے درد کی ٹیس کو دبا لیا۔ "ابھی کچھ دیر میں تم گھر آجاؤ گے۔" فون بند ہو گیا تو نائلہ نے ایک طویل گہری سانس لی اور ریسیور کو کریڈل پر رکھ کے ریشماں کی طرف بڑھی۔ "یوسف بھائی۔۔۔؟"

ڈاکٹر یوسف نے پلٹ کر اسے دیکھا اور مایوسی سے سر ہلایا۔ ڈی ایس پی کمرے کے وسط میں کھڑا انگلیاں چٹخاتا رہا۔

"اس کا زندہ رہنا مشکل تھا یوسف بھائی۔" نائلہ کرسی پر گر پڑی۔ "اب تک وہ ایک جھوٹی امید کا دامن تھامے زندگی کے گھٹن راستے پر چل رہی تھی کہ کسی نہ کسی دن اس کی بیٹی ضرور ملے گی۔ اسی زمین پر۔ یہ امید ٹوٹ گئی تو وہ زمین پر رہ کے کیا کرتی۔ وہ خود اپنی

بیٹی سے ملنے چلی گئی۔"

"سرکاری طور پر ہمیں قبر کھودنے کے احکامات حاصل کر کے لاش تو نکلوانا ہی پڑے گی۔" ڈی ایس پی نے کہا۔ "شناخت کے لیے۔ ناول میں لکھا ہے کہ اسے زہر دیا گیا تھا۔ آرسینک قسم کے عام طور پر استعمال ہونے والے زہر کے اثرات کا دس سال بعد بھی ناخون اور بال دیکھ کر پتا چل جاتا ہے۔ اچھا اب یہاں سے سب لوگ غائب ہو جائیں۔ صرف ڈاکٹر یوسف یہاں رہیں گے۔ ڈاکٹر یوسف ریوالور ہے نا آپ کے پاس۔"

"ہاں۔" یوسف نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اور مجھے ڈر ہے کہ اسے دیکھتے ہی شوٹ نہ کر دوں۔"

"نو، نان سنس۔" ڈی ایس پی نے چٹکی بجائی۔ "آس پاس ہر طرف سادہ کپڑوں میں مسلح افراد چھپے بیٹھے ہیں۔ تمھیں صرف اس کو باتوں میں لگانا ہے۔ اس طرح جیسے تمھیں کچھ معلوم نہیں اور تم صرف مسز نائلہ کی طبیعت کی خرابی کی خبر سن کر آئے ہو۔ تم یہ بھی کہو گے کہ ریشماں سے چائے منگواؤ۔ سردی سے قلفی جم رہی ہے آج تو۔ یا ایسی ہی کوئی بات۔ مجھے آپ کو مکالمے رٹانے کی ضرورت نہیں۔ آپ تو سمجھدار ہیں۔ کرم داد۔ ماں کی لاش کو اٹھوالو۔ آئی ایم سوری۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری بات کا نتیجہ یہ نکلے گا میک اَپ مین کد ھر ت۔۔۔"

'وقت کی رفتار اگر زمین کی گردش کی رفتار ہے۔' نائلہ نے سوچا۔ 'تو زمین ساکت کیوں ہو گئی ہے۔ یہ ایک گھنٹہ ساٹھ منٹ کے بجائے ساٹھ گھنٹوں کا کیوں ہو گیا ہے۔ ایک ایک منٹ گزرتا ہے تو میری عمر کا ایک دن لے جاتا ہے۔ دس منٹ اوپر ہو گئے۔ کیا اسے شک ہو گیا ہے۔ میرے لہجے سے؟ یا اس نے پہلے ہی سب کچھ دیکھ لیا تھا۔ اس کا مطلب ہے وہ نہیں آئے گا۔' وہ لان پر ننگے پاؤں ٹہلتی رہی۔ رحیمہ کے کپڑے پہنے۔۔۔۔ ڈی ایس پی کا چہرہ ایک پل کے لیے کھڑکی میں نظر آیا اور غائب ہو گیا۔ اس نے نائلہ کو واضح اشارہ کیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ گھر کی طرف بڑھی۔ "مسز نواز۔" ڈی ایس پی نے جالی والے دروازے کے پیچھے سے کہا۔ "آگے مت آیئے۔ آپ کے بچے مل گئے ہیں۔ وہ مری کی ایک کاٹیج میں قید تھے۔ ٹیلی فون مری سے کیا گیا تھا۔ ایک پولیس کار اسی وقت مری روانہ ہو گئی تھی۔ وہاں ان دنوں برف کے سوا کچھ نہیں۔ بچے اکیلے تھے اور گھبرا کے باہر نکل آئے تھے۔۔۔ خدا کا شکر ادا کیجیے کہ پولیس والوں نے دوربین سے سفیدی میں دو دھبے سے دیکھ لیے۔ سردی اور بھوک سے وہ نیم جاں تھے۔ اگر ذرا دیر ہو جاتی تو وہ آٹو فال۔ خیر۔ اب وہ ہماری تحویل میں اور بالکل محفوظ ہیں۔ جایئے۔ لان پر حق نواز کا انتظار کیجیے۔"

نائلہ کا حوصلہ دو چند ہو گیا۔ خدا نے اس کی دعا قبول کر لی تھی۔ اب وہ سب کچھ کر سکتی تھی۔ وہ اضطرابی کیفیت میں دروازے تک آتی جاتی رہی۔ پھر اس نے حق نواز کی کار کو دیکھا اور اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ حوصلہ۔ حوصلہ اس نے اپنے آپ سے کہا اور دروازے کی طرف بھاگی۔ "نواز۔" وہ کار کے پیچھے دوڑتی ہوئی پورچ تک آئی۔

نواز نے کار کا دروازہ کھولا اور باہر آ گیا۔ نائلہ نے بے تابی سے کار کا دوسرا دروازہ کھولا۔

"وہ۔۔۔ وہ کہاں ہیں۔ کمینے۔" وہ نواز پر زخم خوردہ شیرنی کی طرح حملہ آور ہوئی۔

"وہ میرے ساتھ نہیں آئے ہیں۔" حق نواز نے اس کو پکڑ کر قابو میں کر لیا۔ "تم میرے ساتھ ان کے پاس چلو گی۔"

نائلہ نے مزاحمت ترک کر دی۔ "ٹھیک ہے۔ میں اپنے وعدے پر قائم رہوں گی۔ جیسا تم کہو گے ویسا ہی کروں گی۔"

"لیکن پہلے وہ تحریر۔" نواز نے کہا۔ "جو میرے تحفظ کی ضمانت ہے۔"

نائلہ نے کوشش کی کہ وہ اپنی اسٹڈی کی طرف نہ دیکھے۔ "اندر چلو۔ میں نے سب کچھ لکھ لیا تھا۔"

"میں اندر نہیں جاؤں گا۔ دو منٹ میں ہمیں یہاں سے نکل جانا ہے۔ میں تم پر اعتماد نہیں کرتا۔ اگر تم نے پولیس کو دو گھنٹے بعد

پہنچنے کو کہا ہو گا تو وہ ٹھیک وقت پر آجائیں گے۔" حق نواز نے کہا۔

"اندر یوسف بھائی بھی ہیں ۔۔۔ وہ صبح سے میرے ساتھ ہیں۔"

"مجھے کسی سے نہیں ملنا۔" وہ برہمی سے بولا۔ "بس وہ تحریر لاؤ اور میرے ساتھ بیٹھ جاؤ۔"

"ٹھیک ہے۔" نائلہ نے تھوک نگل کے کہا۔ "بس... میں آتی ہوں۔" وہ اندر کی طرف لپکی۔ جو اس اور دہشت سے لرزتی ہوئی آہوئے صیادِ دیدہ کی طرح خوف کے چنگل میں گرفتار۔ نواز مسکرایا۔

دو کی بجائے وہ صرف ایک منٹ بعد نمودار ہوئی۔ اس نے حق نواز کی ماں کے کپڑے پہن کر اسے خوش کرنے کی کوشش کی تھی۔ نواز یہ سمجھ گیا تھا کہ اس نے ذہنی طور پر اپنی شکست تسلیم کر لی ہے۔

"یہ لو۔" وہ نواز کے قریب آکے بولی۔ "پڑھ لو۔ جو تم نے کہا تھا میں نے وہی لکھا ہے۔"

نواز نے تحریر کے مضمون کو غور سے پڑھا اور مطمئن ہو کے سر ہلایا۔ مگر سر اٹھا کے دیکھنے پر اس کے ذہن کو بجلی کا جھٹکا لگا۔ اس کے سامنے ایک نہیں دو عورتیں کھڑی تھیں۔ بالکل ایک جیسی۔ دونوں نائلہ تھیں ۔۔۔ یا دونوں رضیہ تھیں۔ مگر پلک جھپکتے میں اس نے اصل اور نقل کے فرق کو پہچان لیا۔ اس نے ریوالور نکالنے کی کوشش کی مگر ایک نائلہ نے اطمینان سے آگے بڑھ کے اس کی کلائی تھام لی۔ "بس راجہ صاحب۔ کھیل ختم ہو گیا۔ اب اندر تشریف لے آئیے۔" دوسری نائلہ نے مردانہ آواز میں کہا۔ "ہم سب اب پبلک کے سامنے اپنے اصل روپ میں آئیں گے۔"

"تم نے اپنے بچوں کو خود سزائے موت دی ہے نائلہ۔" حق نواز نے غضب ناک لہجے میں کہا۔

"نہیں حق نواز۔ اس مرتبہ پھندا تمہارے گلے میں پڑ گیا ہے۔" نائلہ نے کہا۔ "تم نے اپنی ماں کو قتل کیا... ریشماں کی بیٹی کو قتل کیا۔ معصوم اظہر کو قتل کیا۔ پہچانو اس سامان کو۔ تم اسی میک اپ میں رضیہ سلطانہ بن کے گھومتے تھے نا۔ کیونکہ تمہاری صورت اپنی ماں سے بہت ملتی ہے۔"

سادہ کپڑوں میں اِدھر اُدھر سے بہت سے لوگ ہر طرف ایک حلقہ بنانے لگے تھے۔

"رضیہ سلطانہ کے باقی پانچ ناول پسِ از مرگ شائع ہوں گے۔" نائلہ نے کہا۔ "راجہ حق نواز خان مرحوم کے نام سے ۔۔۔ اور وہ جو خود تم نے لکھے تھے۔ عدالت میں پیش ہوں گے۔ تمہیں مرحوم کرنے کے لیے تختۂ دار تک پہنچانے کی خاطر۔"

"گویا تم نے سب دیکھ لیا ہے۔" وہ تلخی سے بولا۔ "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اسٹڈی میں جا گھسو گی۔"

"ہاں ۔ میں نے تمہارا ماضی بھی دیکھ لیا ہے اور تمہارا مستقبل بھی۔" نائلہ نے کہا۔ "پولیس نے ایک اور نائلہ اسی میک اپ کے سامان سے تخلیق کی ہے جو اسٹڈی کے دوسرے کمرے میں سوٹ کیس سے نکلا تھا۔"

"لیکن تمہارے دونوں بچے اب تمہیں نہیں ملیں گے۔"

پولیس کی ایک کار تیزی سے اندر آئی اور حق نواز کی کار کے پیچھے رک گئی۔ اکبر اور اصغر دوڑ کر اترے اور ماں سے لپٹ گئے۔

"تم... تم جا رہی ہو نائلہ۔" کرم داد نے بیگم صاحبہ کہنے کے بجائے پہلی بار اس کا نام لے کر کہا۔

نائلہ نے افسوس اور دکھ سے اس نوجوان کو دیکھا جو اس کا سب سے مخلص دوست تھا۔ "ہاں کرم داد۔ مجھے جانا ہی ہو گا۔"

"تم یہاں بھی تو رہ سکتی ہو۔" اس نے التجا کے انداز میں کہا۔ "میں تمام عمر تمہاری خدمت کروں گا۔"

"لیکن ۔ لیکن کرم داد ۔ میں تمہاری اس خدمت کے بدلے کچھ نہ کر سکوں گی۔"

"میں نے تم سے کچھ مانگا تو نہیں ہے نائلہ۔ صرف اپنی محبت دی ہے۔" وہ بولا۔

"محبت ۔ میرا دل اب پتھر ہو گیا ہے کرم داد۔ اس میں کسی مرد کے لیے محبت کی جگہ نہیں رہی ۔ تم یہ محبت میری طرف سے اس کو تحفے میں دیدو جو راہِ حیات میں تمہاری شریکِ سفر بنے... خدمت کرنا تو بیویوں کا کام ہوتا ہے ۔ مجھے یقین ہے تمہاری بیوی تمہاری بہت خدمت کرے گی۔ تم سے بہت محبت کرے گی۔ بہت خوش قسمت ہو گی ۔۔۔ میں ۔۔۔ میں خوش قسمت نہیں بدبخت ہوں کرم داد۔ ورنہ میرا گھر دوبارہ نہ اجڑتا۔ ہاں تم مجھ سے پہلے ملے ہوتے تو میں اور تم شاید بہت خوش رہتے ۔ لیکن اب میں اپنی تقدیر کی نحوست کا سایہ تمہاری زندگی پر نہیں ڈال سکتی ۔ میں بار بار جوا کھیل کر ہارنے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتی۔ اب میں اپنے لیے نہیں۔ اپنے بچوں کے لیے جیوں گی۔ تم بھی اپنے لیے جیو.. اور ان کے لیے جیو جن کو تمہاری خوشی عزیز ہو۔" اس نے کار اسٹارٹ کی۔

"گڈ بائی انکل کرم داد۔" اکبر اور اصغر نے ہاتھ ہلا کے کہا۔ "آپ ہم سے ملنے لاہور آئیں گے نا؟"

"نہیں بیٹے ۔ میں شاید نہیں آسکوں گا۔" اس نے پلٹ کر کہا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گھر میں داخل ہو گیا۔ نائلہ نے ایک قطرۂ اشک کو آنکھوں سے ٹپکنے سے پہلے انگلی پر لے کر جھٹک دیا اور گاڑی زن سے باہر نکل گئی۔